۲۳

اسلام کا قانون بین الممالک

واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اِسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

سلسلہ مطالعہ اسلامی قانون (۲۳)

اسلام کا قانون بین الممالک

ڈاکٹر محمود احمد غازی

شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ☆ اسلام آباد

اسلام کا قانون بین الممالک

تالیف:	ڈاکٹر محمود احمد غازی
ادارت:	شہزاد اقبال شام
نگران مطالعہ اسلامی قانون:	شہزاد اقبال شام
نگران منشورات:	حافظ حبیب الرحمن/محمد نذیر
ناشر:	شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
طبع اول:	۱۹۹۳
طبع دوم:	۱۹۹۷
طبع سوم:	۲۰۰۲ء
طبع چہارم	۲۰۰۳
قیمت:	۳۰ روپے

فہرست مضامین

۱۔ قانون بین الممالک اور اس کی ضرورت	۱
۲۔ علم سیر۔ ایک تعارف	۲
۳۔ اسلام میں قانون بین الاقوام کا آغاز و ارتقاء۔ ایک تاریخی جائزہ	۴
۴۔ فقہ سیر کے موضوعات اور دائرہ کار	۵
۵۔ فقہ سیر کے مصادر و ماخذ	۶
۶۔ فقہ سیر کی قوت نافذہ	۸
۷۔ اسلام کا تصور امت اور قومیت	۹
۸۔ اہل ذمہ اور غیر مسلم اقلیات	۱۱
(۱) حالت امن	۱۲
(۲) حالت جنگ	۱۳
۹۔ مستامنین	۱۶
۱۰۔ اسلام کا تصور جہاد اور قانون جنگ	۱۹
۱۱۔ پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء	۲۸
۱۲۔ اسلام میں غیر جانبداری کا تصور	۳۲
۱۳۔ مزید مطالعہ کے لئے	۳۷
۱۴۔ حواشی و حوالہ جات	۳۷

پیش لفظ

اسلام کی طویل فکری اور عملی تاریخ میں مسلم اہل علم و دانش کو گوناگوں چیلنجوں اور مبارزتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دور تابعین میں وضع حدیث اور قضاء و قدر کے بارہ میں شبہات سے لے کر دور جدید کے مغربی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے استیلاء تک کا یہ سارا زمانہ ایک مسلسل فکری جہاد اور علمی دفاع سے عبارت ہے۔ اس پورے دور میں اہل علم نے نہ صرف حالات زمانہ کو پیش نظر رکھا' بلکہ ہر نئی فکری مبارزت کے جواب میں اکثر و بیشتر انہی ہتھیاروں اور وسائل سے کام لیا جن سے کام لے کر اسلام پر اعتراضات کئے گئے۔ اس کی کامیاب ترین مثال یونانی علوم و فنون سے مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ ابتدائی سو' سوا سو سال کے عبوری دور کے بعد بھی مسلمان مفکرین نے یونانی منطق اور فلسفہ سے اسلامی عقائد کی تفسیر و توضیح کی اور اسلامی تعلیمات کی تبیین و تفہیم کا وہ کام لینا شروع کر دیا تھا جس کے عجیب و غریب نمونے امام غزالی' امام رازی' امام شاطبی اور شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ کی تحریروں میں ملتے ہیں۔

دور جدید میں اس کام کی اہمیت اور پیچیدگی پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ پہلے مبارزت صرف ایک میدان میں تھی' یعنی فلسفہ' منطق اور عقلیات کا میدان۔ اب یہ مبارزت زندگی کے ہر میدان میں ہے۔ فلسفہ اور انسانی علوم سے لے کر روزمرہ زندگی کے مظاہر تک' آج ہر قدم پر دنیائے اسلام کو بیرونی اور خارجی قوتوں سے قدم قدم پر نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے۔ ان میں سے بعض مقامات میں یہ نبرد آزمائی نسبتاً" زیادہ اہم اور فوری نوعیت کی ہے اور حالات کا تقاضا ہے کہ ملت مسلمہ ان معاملات کے بارہ میں فوری طور پر اپنے کو صف آراء کرے اور اپنے وسائل و اسباب کو کماحقہ استعمال کرے۔ ان اہم اور فوری امور میں ایک انتہائی اہم مسئلہ قانونی' دستوری اور عدالتی معاملات کا ہے۔ اس میدان میں مغربی تصورات و افکار کے تسلط اور غلبہ نے ایک بڑے طبقہ کے ذہن کو متاثر بلکہ ماؤف کر دیا ہے کہ یہ طبقہ اسلام کے تصورات و نظریات کو سمجھنے میں اس طرح مشکل محسوس کرتا ہے جس طرح کوئی بھی مغربی دانشور۔ تاہم یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ دنیائے اسلام میں اس صورت حال کے خلاف ایک شدید رد عمل اٹھتا نظر آرہا ہے جو اگر مثبت اور تعمیری خطوط پر آگے بڑھا تو ایک بڑی خوشگوار تبدیلی کا ذریعہ بنے گا۔

اسی رد عمل کا مظہر وہ دلی آرزو ہے جو اسلام کے تصور عدل و احسان پر مبنی معاشرہ کے قیام اور اسلامی تصورات کے عملی نفاذ عالم اسلام کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں اٹھتی نظر آتی ہے۔ اسی آرزو کی تکمیل کے انتظار میں آج لاکھوں گردنیں کٹ رہی ہیں' لاکھوں گھر اجڑ رہے ہیں' کتنے ہیں جو گھر سے بے گھر ہو رہے ہیں اور کروڑوں دل ہیں جو اس دیرینہ خواب کی تعبیر کی تمنا میں دھڑک رہے ہیں۔ لیکن اس خواب کی تعبیر اس قدر آسان نہیں ہے جتنا ہم میں سے بعض حضرات سمجھتے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر ایک طویل سفر کی متقاضی ہے۔ ایسا طویل سفر جس کی پہلی منزل' ایک فکری تبدیلی' ایک تعلیمی تحریک اور ایک ذہنی

انقلاب سے عبارت ہے - جب تک اسلام کے تصورات و تعلیمات پر گہرا ایمان رکھنے والی' دور جدید میں ان کو روبہ عمل لانے کے جذبہ سے سرشار اور اس راہ کی مشکلات سے کلی طور پر آگاہی اور ادراک رکھنے والی نسل وجود میں نہیں آئے گی اس وقت تک اس خواب کو حقیقت کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔

اس پہلی منزل کا پہلا قدم اسلامی فقہ اور قانون کی کماحقہ تعلیم و تدریس اور اس سلسلہ میں ضروری مردان کار کی تیاری کا کام ہے۔ ایسے مردان کار جو اسلامی فقہ کو اس کے بنیادی ماخذ و مصادر سے براہ راست سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں' جن کو رائج الوقت قانونی' دستوری' اور عدالتی تصورات سے گہری لیکن ناقدانہ واقفیت حاصل ہو' جو شریعت کی حقانیت اور صلاحیت پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں اور دور جدید میں اس کی تعلیمات کو روبہ عمل لانے کا مومنانہ جذبہ رکھتے ہوں۔ ایسے افراد کی تیاری وقت کی وہ اہم ضرورت ہے جس کو ہماری ملی ترجیحات میں ابھی تک وہ جگہ حاصل نہیں ہوئی جو اس کو ہونی چاہیے تھی۔

بلاشبہ ہمارے بہت سے دینی اداروں اوراسلامی تعلیم کے مراکزمیں فقہ کی تدریس و تحقیق کا کام ہو رہا ہے اور فقہی موضوعات پر کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ سب کچھ قطعاً" ناکافی ہے۔ اس تعلیم و تحقیق کاہمارے قانونی نظام اور دستوری اداروں پر اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ملک میں نفاذاسلام کے کام میں پیش رفت نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی شریعہ اکیڈمی اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قائم کی گئی۔ اکیڈمی نے وکلاء اور ارکان عدلیہ کے تربیتی پروگراموں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ایک شعبہ قائم کیا جس کے تحت اردو اور انگریزی میں مختلف موضوعات پر جدید انداز سے اسلامی قوانین کے مختلف پہلوؤں پر کتابوں کی اشاعت کے ایک طویل المیعاد منصوبے کا آغاز کیا گیا ہے۔ تصنیف و تحقیق اور نشر و اشاعت کے اس طویل منصوبہ کے ساتھ ساتھ اکیڈمی نے آج سے چند سال قبل ایک شعبہ ایسا بھی قائم کیا جہاں فاصلاتی تعلیم کے اصولوں کے تحت فقہ اسلامی کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری یہ متواضعانہ پیش کش مقبول ہوئی اور اللہ رب العزت نے اپنی بے پایاں نعمت اور لامتناہی فضل سے ہماری اس کاوش کو کامیابی سے نوازا اور ہم تین سال کی مختصرمدت میں اس کورس کے ذریعہ پاکستان اور بیرون پاکستان کے کوئی ڈیڑھ ہزار افراد تک اسلامی قانون اور فقہ کی ایک مربوط اور جامع تصویر پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

زیر نظر کورس وکلاء' طلبہ قانون اور عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے ہے۔ اس کا دورانیہ ایک سال ہے اور یہ چوبیس اسباق یا یونٹوں پر مشتمل ہے جن میں فقہ اسلامی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ ہر سبق میں تدریسی مواد کے ساتھ ساتھ مزید مطالعہ کے لئے کتابوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

مطالعہ قانون اسلامی کے اس ابتدائی کورس کے بعد چار دوسرے کورس بھی تیار کرائے جارہے ہیں جو فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر ہیں۔ ہمارے ان "ایڈوانس کورسز" کی تیاری کا کام جاری ہے اور جلد ہی ہم ان کو بھی شروع کر دیں گے۔

کچھ اس یونٹ کے بارہ میں

مطالعہ اسلامی قانون کورس کی آخری چند کڑیوں میں سے زیر نظر موضوع اسلام کے قانون بین الممالک سے متعلق ہے۔ اس سے قبل کے ایک یونٹ میں آپ اسلام کے دستوری مباحث پر ایک مکمل یونٹ پڑھ چکے ہیں۔ دستوری مسائل کے بعد مناسب ہے کہ اسلامی ریاست کے دوسرے ممالک سے تعلقات کا بھی بھرپور جائزہ لیا جائے۔ یہ موضوع بظاہر چند مباحث سے عبارت ہے جو باسانی فقہ کی متداول کتابوں میں مل جاتے ہیں۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود اس کام میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ گزشتہ چند دہائیوں میں نسلی، وطنی، لسانی، علاقائی اور دوسرے کئی فتنوں کی اساس پر دنیائے اسلام میں بھی متعدد ریاستیں وجود میں آ چکی ہیں اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ان فتنوں کا وجود بظاہر پائیدار سے پائیدار تر ہوتا نظر آ رہا ہے۔ ان تازہ فتنوں سے عالم اسلام کی مملکتیں بھی خود کو نہ بچا سکیں۔ اس صدی کے وسط میں مصر سے عرب نیشنلزم کا جو طوفان اٹھا اس کے منفی اثرات آج بھی عالم عرب کے بیشتر ممالک کی صحافت، تعلیمی اداروں، ذرائع ابلاغ اور دانشگاہوں میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ وسطی ایشیا کے نو آزاد ممالک کے لوگوں میں نسلی، لسانی اور علاقائی وحدت کے اصول پر ریاستی ترکیب و تکوین کا جو تصور جاگزیں ہو چکا ہے اس کو اگر آج سے ہی کھرچ کھرچ کر صاف کرنے کا عمل شروع کیا جائے تو بھی اس کے لیے مدت درکار ہے۔

یہ محض دو مثالیں ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قانون بین الاقوام کے نہ صرف موضوعات میں بلکہ اس کے فکری پس منظر میں کس قدر عظیم تغیر واقع ہو چکا ہے۔ ماضی میں مختلف اور متعدد اسلامی مملکتوں کا اپنا الگ الگ وجود یقیناً انتظامی طور پر ایک مسلمہ امر تھا، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ دنیائے اسلام کا ہر فرد اور مسلم مملکتوں کا ہر شہری ہر اسلامی مملکت کا خود بخود شہری ہوا کرتا تھا۔ ہر مسلمان بغیر کسی ویزا اور امان کے حجاز مقدس کی حدود میں محض مسلمان ہونے کے ناطے سے نہ صرف داخلہ کے حقوق رکھتا تھا بلکہ وہاں پر قیام کرنا چاہتا تھا تو بھی اس پر کوئی پابندی نہ تھی۔ آج مغربی نیشنلزم اور دوسرے گمراہ کن افکار نے جہاں عام آدمی کے ذہن کو آلودہ کر رکھا ہے وہاں کارپردازان حکومت بھی اس سے نہیں بچ سکے اور حالت یہ ہے کہ مسلمان ایک امت ـــــ جسد واحد ـــــ کا جزولاینفک ہونے کے باوجود ایک مسلم ملک سے دوسرے مسلم ملک میں جانے کے لیے اتنی آزادی بھی نہیں رکھتے جتنی اہل یورپ کو آپس کے ممالک میں حاصل ہے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ اسلامی قانون بین الممالک ـــــ السیر ـــــ کا یکسر نئے انداز میں جائزہ لیا جائے اور اس کو عہد جدید کی اصطلاحات میں پیش کیا جائے۔ یہ کام نہ تو آن واحد میں ممکن ہے اور نہ اس کے لیے عمر خضر کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔

اس یونٹ کی ابتداء میں قانون بین الممالک کا مختصر تعارف کرانے کے بعد علم سیر کے حوالے سے ایک مختصر گفتگو کی گئی

ہے۔ قانون بین الممالک کا آغاز کیسے ہوا' یہ کن ارتقائی مراحل سے گزرا' کب اس نے ایک مستقل موضوع کی حیثیت اختیار کی۔ فقہ سیر کے موضوعات اور دائرہ کار' اس کے مصادر و مآخذ اور قوت نافذہ' یہ تمام اس یونٹ کے چند ابتدائی موضوعات ہیں۔ جن کے بعد اسلام کے تصور امت اور عہد جدید کے تراشیدہ ایک ہولناک اور تباہ کن بت ـــــ قومیت ـــــ پر گفتگو کی گئی ہے۔ اہل ذمہ اور اقلیات کے حقوق و فرائض بھی ہمیشہ سے علم سیر کے موضوعات میں رہے ہیں۔ مستامنین کے مسائل پر تو فقہاء نے کتب فقہ میں مستقل ابواب باندھے ہیں۔ اعتزال یعنی غیر جانبداری کا تصور بھی ایک مستقل موضوع ہے جس پر علم سیر میں پر مغز گفتگو ملتی ہے۔

زیر نظر یونٹ میں ان تمام موضوعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علم سیر کے موضوعات پر جتنی بھی گفتگو کی جائے' یہ اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اسلام کے تصور جہاد پر گفتگو نہ کی جائے۔ اس لیے اس عنوان کے تحت یونٹ کے آخری حصے میں جہاد اور قانون جنگ پر ایک مستقل لیکن مختصر بحث کی گئی ہے۔ آخر میں جدید قانون بین الممالک کے ایک عنوان "پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء" کا اسلامی قانون بین الممالک کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ یونٹ کے آخر میں مزید مطالعہ کے لیے بعض مفید کتب کی نشاندہی کی گئی ہے۔

زیر نظر یونٹ اپنے موضوع پر ایک متواضعانہ کوشش ہے جس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اہل علم اس کی طرف متوجہ ہو کر تحقیق' تفتیش کی ان نئی راہوں کو تلاش کریں جو مسلم امت کو اس کی منزل کی طرف لے جا سکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس کوشش کو قبول فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی
ڈائریکٹر جنرل' شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی' اسلام آباد

۶ جمادی الآخر ۱۴۱۸ھ
۹ اکتوبر ۱۹۹۷ء

اسلام کا قانون بین الممالک

۱۔ قانون بین الممالک اور اس کی ضرورت

مملکتوں اور ریاستوں کے درمیان تعلقات۔ محاربانہ اور دوستانہ دونوں۔ کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود انسانوں کی مدون تاریخ۔ جب بھی انسانوں کے ایک سے زائد گروہ مل جل کر رہیں گے ان کے درمیان کسی نہ کسی قسم کے تعلقات ضرور جنم لیں گے۔ یہ گروہ برادریاں ہوں' شہری ریاستیں ہوں' بڑی بڑی سلطنتیں اور شاہنشاہیاں ہوں یا دور جدید کی جمہوری ریاستیں' ان سے کسی کے لئے بھی تنہا اور دوسروں سے کٹ کر رہنا ممکن نہیں ہے۔ ان کے مابین جب بھی مراسم قائم ہوں گے وہ کسی نہ کسی رواج یا طے شدہ اصول پر مبنی ہوں گے۔ یہی اصول اور رواج جب باقاعدہ قانون بنتے چلے گئے تو بین الاقوامی یا بین الممالک قانون وجود میں آتا چلا گیا۔

یہ کہنا تو بڑا دشوار ہے کہ سب سے پہلے کس قوم اور کس علاقہ میں بین الممالک یا بین الاقوامی تعلقات کے باقاعدہ اصول اور قواعد سامنے آئے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب سے اولاد آدم نے جداگانہ قبیلوں اور خاندانوں کی شکل میں رہنا شروع کیا ہے اسی وقت سے تعلقات باہمی کے یہ قواعد بھی وجود میں آنے شروع ہو گئے تھے۔ شروع میں باہمی میل جول اور لین دین کے معاملات یقیناً انفرادی آراء' ثالثوں کے فیصلوں یا پیغمبروں کی ہدایات کے بموجب طے ہوتے رہتے ہوں گے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سب چیزیں نظائر کی شکل اختیار کرتی چلی گئی ہوں گی اور بعد میں اس نوعیت کے دیگر معاملات میں بھی ان پر عمل کئے جانے سے ان کی حیثیت طے شدہ قواعد کی ہوتی چلی گئی ہو گی۔

ابتداء میں یہ قواعد قبائل کے مابین تعلقات کو منضبط کرنے کے لئے وجود میں لائے گئے' بعد جب شہری مملکتوں کا دور آیا تو یہ قواعد مزید نکھرے اور شہری مملکتوں کے مابین روابط کو استوار کرنے میں ان سے مدد لی گئی۔ آخر میں جب بڑی بڑی بادشاہتوں کے بین الاقوامی تعلقات کے سلسلہ میں قواعد اور اصولوں کی ضرورت پیش آئی تو نسبتاً زیادہ مرتب اور واضح اصول سامنے آئے اور یوں ایک باقاعدہ بین الاقوامی قانون کی بنیادیں پڑنے لگیں۔ یوں بھی تنہائی انسان کے مزاج کے خلاف ہے۔ انسان انفرادی طور پر بھی دوسرے افراد معاشرہ سے مل جل کر رہتا ہے۔ اور خاندانی اور اجتماعی طور پر بھی دوسرے خاندانوں اور گروہوں کے ساتھ روابط رکھنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ یہی حال ریاستوں کا ہے کوئی ریاست بھی دوسری ریاستوں سے کٹ کر نہیں رہ سکتی۔ اس کے تعلقات و روابط دوسری ریاستوں سے لازماً رہتے ہیں۔ کبھی جنگ ہوتی ہے' کبھی اور قسم کے اختلافات ہوتے ہیں۔ کبھی صلح اور دوستی کے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں بین الاقوامی تجارت کسی نہ کسی طرح جاری رہتی ہے اور حکومتیں اپنی اپنی مصلحتوں اور قائم الوقت صورت حال کی روشنی میں اس کو منضبط کرنے کے لئے قواعد وضع

کرتی رہتی ہیں۔

دیگر اقوام اور تہذیبوں میں بین الاقوامی قانون ایک خود رو ارتقاء کے نتیجہ میں سامنے آیا۔ ابتداء غیر واضح اور نامعلوم آغاز رکھنے والے رواجات سے ہوئی جو معاشرہ کے دیگر طریقوں اور ضوابط سے اس طرح مخلط تھے کہ بین الاقوامی رواجات کو دیگر رواجات سے الگ کرنا مشکل تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قانونی نوعیت کے رواجات الگ اور معاشرتی یا اخلاقی نوعیت کے رواجات الگ ہوتے گئے' اور کئی بلکہ کئی ہزار سال کے مسلسل تجربات کے بعد ضرورت محسوس کی گئی کہ بین الاقوامی تعلقات کے قواعد و ضوابط کو جداگانہ قانون کے طرز پر مرتب کیا جائے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کا بین الاقوامی قانون اپنا ایک منفرد اور متعین نقطہ آغاز رکھتا ہے' اس کی ابتداء تاریخ کی پوری روشنی میں ہوئی' اس کے بنیادی اصول واضح اور طے شدہ ہیں' اس کے ارتقائی مراحل میں ایک فکری تسلسل پایا جاتا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اسلام میں بین الاقوامی قانون کا آغاز کب اور کیسے ہوا۔

۲۔ علم سیر' ایک تعارف

قرآن پاک' سنت رسولؐ اور تعامل صحابہ کی بنیاد پر جب اسلامی قانون (فقہ) کی تدوین کا عظیم الشان کام شروع ہوا تو جلد ہی فقہ کی مختلف شاخیں الگ الگ فقہی علوم کے طور پر مدون ہونا شروع ہو گئیں۔ پہلی صدی ہجری کے اواخر ہی سے فقہ کی مختلف شاخوں کے الگ الگ نام پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ اسلام کے قانون ضابطہ کے لئے ادب القاضی' بین الاقوامی قانون کے لئے علم سیر' دیوانی قانون کے لئے معاملات کی اصطلاحات فقہ اسلامی کی قدیم ترین دستیاب کتابوں میں ملتی ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات' جنگ و صلح کے قواعد و ضوابط اور معاہدہ جات کے اسلامی احکام مرتب کرنے میں فقہائے کرام کو قرآن پاک کی متعلقہ آیات اور احادیث نبوی سے بھی زیادہ حضور علیہ السلام کے غزوات اور صحابہ کرام کے معرکہ ہائے جہاد کے واقعات و نظائر سے راہنمائی ملی۔ اس لئے جن اہل علم نے سیر اور بین الاقوامی قانون کے اصولوں سے دلچسپی لی انہوں نے سیرت کے مطالعہ کو اپنی خصوصی دلچسپی کا مرکز بنایا اور اسلام کے ابتدائی غزوات اور جنگوں کے بارہ میں تفصیلات جمع کرنے پر خاص توجہ دی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض اہل علم جنہوں نے مغازی کے موضوع پر تحقیق کی انہوں نے سیر پر بھی قلم اٹھایا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب بعض اہل علم نے اسلام کے بین الاقوامی قانون کے لئے علم السیر والمغازی کی اصطلاح بھی استعمال کی۔

لیکن جلد ہی علم سیر کے ضروری احکام مرتب ہو گئے اور وہ ایک باقاعدہ قانونی علم کے طور پر اپنی جداگانہ شناخت کا حامل بن گیا اور علم سیرت النبی اور علم مغازی سے اس کا براہ راست تعلق ختم ہو گیا۔ تاہم کئی مصنفین بعد تک اس کو علم السیر والمغازی یا علم السیر والجہاد کے ناموں سے یاد کرتے رہے۔ اگرچہ قطعیت کے ساتھ یہ کہنا

دشوار ہے کہ سب سے پہلے کس فقیہ نے اسلام کے قانون بین الاقوام کے لئے سیر کی اصطلاح استعمال کی لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ پہلی صدی ہجری کے ختم ہونے تک یہ اصطلاح اس علم کے لئے ایک معروف اصطلاح بن چکی تھی اور جب دوسری صدی ہجری کے ابتدائی سالوں میں امام زید بن علی بن الحسین (متوفی ۱۲۰ھ) نے کتاب المجموع مرتب کی تو انہوں نے بین الاقوامی قانون کے لئے بے تکلف سیر ہی کی اصطلاح استعمال کی۔ اس اعتبار سے امام زید بن علی پہلے فقیہ ہیں جن کی فقہی تصنیف آج دستیاب ہے اور اس میں علم سیر کی اصطلاح موجود ہے۔ امام زید بن علی کے فوراً بعد کے سالوں میں امام ابو حنیفہ نے سیر کے نام سے اسلام کے بین الاقوامی قانون پر ایک مستقل بالذات رسالہ مرتب کیا جس کو انسان کی معلوم و مدون تاریخ میں بین الاقوامی قانون پر لکھی جانے والی پہلی کتاب قرار دیا جانا چاہیے۔ امام ابو حنیفہ کی اس کتاب نے اس دور کے علمی حلقوں پر بہت اثر ڈالا اور جا بجا اس کتاب کے مندرجات اور اس میں بیان کردہ اجتہادات کے بارہ میں مباحثے شروع ہو گئے۔ بعض فقہاء نے امام ابو حنیفہ کی اس کتاب کے بعض مندرجات کی تردید میں کتابیں بھی لکھیں۔ ان میں سے جو کتاب جلد معروف ہوئی وہ شام کے فقیہ اور امام عبدالرحمٰن اوزاعی کی کتاب سیر الاوزاعی تھی۔

ان دونوں کتابوں کی تدوین و اشاعت سے علم سیر نہ صرف ایک منفرد علم کے طور پر متعارف، متمیز اور مقبول ہوا بلکہ اس کی حدود اور موضوعات بھی متعین ہو گئے۔ انہی دنوں فقہاء کرام نے سیر کی فنی تعریفات بھی وضع کیں۔ ان تعریفات میں سب سے زیادہ جامع تعریف مشہور حنفی فقیہ امام سرخسی (متوفی ۴۸۳ھ) کی پیش کردہ ہے، امام سرخسی لکھتے ہیں:

> جاننا چاہیے کہ سیر سیرت کی جمع ہے (جس کے معنی طرز عمل اور رویہ کے ہیں)۔ اس کتاب کا نام سیر اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں مسلمانوں کے اس طرز عمل سے بحث کی گئی ہے جو مشرکین یعنی برسر جنگ دشمنوں اور ان لوگوں سے تعلقات کے بارہ میں اختیار کیا جاتا ہے جن سے کوئی معاہدہ ہے، یعنی ان کو امان دی گئی ہے یا ان کی حفاظت کی ذمہ داری لی گئی ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں مرتدین کے ساتھ کئے جانے والے معاملات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو کفار کی بدترین قسم سے تعلق رکھتے ہیں کہ ایک بار دین کے اقرار و اعتراف کے بعد منکر ہو گئے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں سے تعلقات کا ذکر ہے جنہوں نے بغاوت کا ارتکاب کیا ہے جن کی حیثیت کفار و مشرکین کے مقابلہ میں بہتر ہے، اگرچہ ان کا رویہ جہالت پر اور تاویلات باطل پر مبنی ہے!۔

امام سرخسی کی اس تعریف سے واضح ہے کہ سیر سے مراد اسلامی قانون کا وہ شعبہ ہے جو کفار و مشرکین، برسر جنگ دشمنوں، معاہدین، مستامنین، اہل ذمہ، مرتدین اور باغیوں سے مسلمانوں کے روابط اور تعلقات کے احکام

بیان کرتا اور ان کو منظم کرتا ہے۔

۳۔ اسلام میں قانون بین الاقوام کا آغاز و ارتقاء۔۔ ایک تاریخی جائزہ

اسلام میں بین الاقوامی تعلقات کا آغاز ہجرت مدینہ سے قبل ہی ہو گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل سے روابط کا آغاز مکہ مکرمہ کے دوران قیام ہی میں فرما دیا تھا۔ بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؐ نے ہجرت حبشہ کے موقعہ پر جو ۵ نبوی میں ہوئی تھی شاہ حبشہ نجاشی کے نام ایک نامہ مبارک بھی تحریر فرمایا تھا جس کو اسلامی تاریخ کا پہلا باقاعدہ بین الاقوامی رابطہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام روابط مکہ مکرمہ میں زیر تشکیل امت مسلمہ کی طرف سے کئے جا رہے تھے اور یقیناً قرآن اور وحی الٰہی کی رہنمائی میں وقوع پذیر ہو رہے تھے۔ قرآن اور وحی الٰہی کی انہی عمومی ہدایات کو اسلام کے قانون بین الاقوام کا آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔

مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد حضور علیہ الصلواۃ والسلام نے باقاعدہ ایک ریاست کی تشکیل کا فریضہ ایک حیرت انگیز معجزانہ سرعت کے ساتھ انجام دیا جس کے نتیجہ میں بہت سے قبائل سے معاہدات کئے اور ان کو ایک ایسے بین الاقوامی نظام میں سمو دیا جس میں اسلام اور اسلامی ریاست کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یاد رہے کہ عرب میں ہر قبیلہ کی حیثیت ایک آزاد اور خودمختار سیاسی وحدت کی تھی اور ان میں سے ہر ہر قبیلہ کو معاہدہ کی لڑی میں پرونے کا عمل اتنا ہی مشکل اور اہم تھا جتنا آج کی آزاد ریاستوں کو کسی نظام میں شامل کرنا۔

اس سارے عمل میں آپؐ کو معاہدات بھی کرنے پڑے، جنگیں بھی لڑنی پڑیں اور بین الاقوامی نوعیت کے وہ سارے اقدامات کرنے پڑے جو ایک بین الاقوامی انقلابی پیغام رکھنے والی ریاست کے سربراہ کو کرنے پڑتے ہیں۔ اس عمل کی راہنمائی وحی الٰہی نے قرآن پاک کی آیات کے ذریعہ کی جن میں جنگ و صلح، معاہدات، جنگ بندی، جنگی قیدیوں کا مسئلہ، اور ان جیسے بے شمار امور میں نئی ہدایات اور نئے احکام دیئے گئے۔ ان ہدایات و احکام کی تفصیلات خود رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی خصوصی ہدایات اور راہنمائی میں سنت کے ذریعہ بیان فرمائی۔ اس طرح دس سال کے قلیل عرصہ میں اسلام کے بین الاقوامی قانون کی وہ بنیادیں فراہم ہو گئیں جن پر فقہائے اسلام نے اپنے اپنے اجتہادات، فقہی آراء اور ضروریات و حالات کی روشنی میں عظیم الشان عمارتیں تعمیر کیں۔

پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے اوائل ہی سے اسلامی قوانین کی تدوین اور قانونی تصورات کی تشکیل کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ اور دوسری صدی ہجری کا وسط آتے آتے فقہ اسلامی کے الگ الگ ابواب پر جداگانہ کتابیں منظر عام پر آنے لگیں۔ اسلام کے بین الاقوامی قانون کے موضوعات پر امام ابو حنیفہ (متوفی ۱۵۰ھ)، امام اوزاعی (متوفی ۱۵۷ھ) امام ابو یوسف (متوفی ۱۷۹ھ) امام ابراہیم فزاری (متوفی ۱۸۶ھ)، امام محمد بن الحسن الشیبانی (متوفی ۱۸۹ھ) امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ)، علامہ واقدی (متوفی ۲۰۷ھ) کی تحریریں مکمل یا نا مکمل شکل

میں آج بھی دستیاب ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں کام امام ابو حنیفہ کے نمایاں شاگرد امام محمد بن الحسن الشیبانی کا ہے جن کو بجاطور پر بہت سے مغربی اور مشرقی مصنفین نے بین الاقوامی قانون کا موسس اول قرار دیا ہے۔ ان کی دو کتابیں السیر الصغیر اور السیر الکبیر اپنے موضوع پر مقبول ترین اور جامع ترین کتابیں رہی ہیں۔

۴۔ فقہ سیر کے موضوعات اور دائرہ کار

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے سیر یا اسلام کے قانون بین الاقوام میں مسلمانوں کے غیر مسلموں، باغیوں اور مرتدوں سے تعلقات سے بحث کی جاتی ہے، اس لئے اس کے موضوعات میں وہ تمام امور شامل ہیں جن کا بالواسطہ یا بلا واسطہ کوئی نہ کوئی تعلق مذکورہ بالا مباحث سے ہے۔ چنانچہ سیر کی کتابوں میں جن مباحث کا ذکر ملتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ نظری اور مذہبی اعتبار سے دنیا کے ممالک کی تقسیم دارالاسلام، دارالحرب، دارا لکفر، دارا لصلح اور دارا لعہد جیسے مباحث جن کی رو سے یہ بحث کی گئی کہ کسی علاقہ یا ملک کی حکومت اور وہاں کے لوگوں کا اسلام کے ساتھ کیا طرز عمل اور مسلمانوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک ہے۔

۲۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات جن میں اسلامی ریاست کے اندر رہنے والے غیر مسلم اور باہر بسنے والے غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔ اس ضمن میں غیر مسلموں کی حیثیت، ان کے حقوق و مراعات اور اس سلسلہ میں لی جانے والی ذمہ داری (گارنٹی) سے متعلق مسائل بھی زیر بحث آتے ہیں۔ مزید برآں عارضی طور پر مسلمانوں سے رابطہ کرنے والے غیر مسلم غیر ملکیوں کے معاملات مثلاً ویزا، امان، سفارت، تجارت وغیرہ کے امور بھی اس میں نمایاں شامل ہیں۔

۳۔ مسلمانوں کے آپس کے وہ اختلافات جو جنگ و جدل کی حد تک پہنچ جائیں ان میں اندرونی بغاوتیں، بدامنی، حرابہ، ارتداد اور ان جیسے دیگر مسائل شامل ہیں۔

۴۔ دو مسلم ریاستوں کے مابین تعلق کی نوعیت۔ ان میں اسلامی ریاست اور دیگر غیر مسلم ریاستوں میں بسنے والی مسلم آبادیوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت سے بھی بحث ہوتی ہے۔

۵۔ جنگ کا تصور اور جنگ کے احکام جس کی بنیاد اسلام کے تصور جہاد پر ہے۔ اسی میں دوران جنگ مباحات و نواہی، حقوق مقاتلین و غیرمقاتلین، مال غنیمت اور جنگی قیدیوں کے معاملات سے بحث ہوتی ہے۔

۵۔ فقہ سیر کے مصادر و مآخذ

بنیادی طور پر تو سیر کے مصادر و مآخذ وہی ہیں جو فقہ اسلامی کے دیگر ابواب (عبادات، معاملات وغیرہ) کے ہیں، یعنی قرآن مجید، سنت رسول، اجماع اور قیاس و اجتہاد۔ لیکن سیر کے احکام کی تدوین میں فقہائے اسلام نے بعض ایسے دیگر مصادر سے بھی کام لیا ہے جو بنیادی طور پر قرآن پاک یا سنت سے ماخوذ ہیں۔ یہ دیگر خصوصی مصادر درج ذیل ہیں:

۱۔ تماثل یا مجازات

۲۔ عرف اور رواج

۳۔ تحکیم کے فیصلے

۴۔ معاہدات

۵۔ مسلمان حکمرانوں اور فاتحین کے نظائر اور تعامل

ذیل میں ان نئے مصادر کی مختصر تشریح اور وضاحت کی جاتی ہے:

۱۔ تماثل یا مجازات (Reciprocity) کا اصول بین الاقوامی تعلقات کے باب میں خود قرآن پاک میں موجود ہے۔ سورہ البقرہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اگر دشمن تمہارے خلاف زیادتی کرے تو اس کے جواب میں ویسا ہی اور اتنا ہی اقدام تم بھی کر سکتے ہو[۲]۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ برائی کے بدلہ میں دشمن کے خلاف ویسا ہی اقدام کیا جا سکتا ہے[۳]۔ ولا یجرمنکم شنان قوم اور ھل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ ان آیات مبارکہ کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے تماثل یا مجازات کو اسلام کے بین الاقوامی قانون کا ایک اہم اصول سمجھا ہے۔ اس اصول کی رو سے ایک اسلامی ریاست دوسری ریاستوں سے تعلقات میں اس معاملہ اور طرز عمل کو پیش نظر رکھے گی جو وہ ریاستیں اسلامی ریاست کے ساتھ اختیار کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر جو ریاست اسلامی ریاست کے باشندوں کو خصوصی مراعات سے نوازتی ہے اسلامی ریاست بھی اس ریاست کے باشندوں کو ویسی ہی مراعات سے نوازے گی، بشرطیکہ ان مراعات میں کوئی چیز اسلام کے احکام سے متعارض نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی ریاست مسلمانوں پر پابندیاں عائد کرتی ہے تو اسلامی ریاست بھی اس ریاست کے باشندوں پر ویسی ہی پابندیاں عائد کر دے گی۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رہے کہ اگر کوئی غیر مسلم ریاست اپنی مسلم اقلیت کو تنگ کرتی ہے تو اس کے جواب میں اسلامی ریاست کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی غیر مسلم اقلیت کو تنگ کرنا شروع کر دے اور غیر مسلموں کے وہ حقوق ان کو نہ دے جو ان کو اسلام میں دیئے گئے ہیں۔

مجازات کے اس اصول کے تحت حضرت عمر فاروقؓ نے ان غیر مسلم تاجروں پر جو دوسری قریبی ریاستوں

سے تجارت کی غرض سے اسلامی ریاست میں آیا کرتے تھے' دس فیصد کسٹم ڈیوٹی عائد کی تھی۔ جب آنجناب کو معلوم ہوا کہ یہ ریاستیں اپنے ہاں آنے والے مسلمان تاجروں سے دس فیصد کسٹم ڈیوٹی وصول کرتی ہیں تو آپ نے بھی جواباً" ان کے تاجروں پر وہی ڈیوٹی مقرر فرما دی۔

امام سرخسی نے اصول مجازات کے تحت کسٹم ڈیوٹی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر کسی غیر ملک میں مسلمان خواتین اور بچوں کو اس ڈیوٹی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے تو اسلامی ریاست بھی اس ملک کے بچوں اور خواتین کو کسٹم ڈیوٹی سے مستثنیٰ کر دے گی[۴]۔

۲۔ شریعت جس طرح عام قوانین کے معاملہ میں عرف اور رواج کو بعض حدود کے اندر ایک جائز ماخذ قانون تسلیم کرتی ہے اسی طرح بین الاقوامی قانون اور خاص طور پر بین الاقوامی تعلقات کے باب میں بھی اس کو تسلیم کرتی ہے۔ قرآن میں جا بجا جس المعروف کا ذکر ہے[۵]' اس سے مراد وہ جائز اور پسندیدہ رواج ہے جو عام طور پر معروف و مقبول ہو اور شریعت کے احکام سے متعارض نہ ہو۔ قرآن میں بہت سے احکام کا دارومدار اسی معروف کو ٹھہرایا گیا ہے۔ ایک دوسری آیت میں العرف کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے اور اس کی بنیاد پر حکم دینے کی تعلیم ہے[۶]۔ قرآن پاک کی طرح سنت رسول ﷺ میں بھی بہت سے احکام عرف اور معروف کی بنیاد پر دیئے گئے ہیں۔ فقہائے اسلام نے متعدد اصول اور فقہی ضابطے اصول عرف کی بنیاد پر مرتب کئے جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ العادة محكمة (مجلّہ الاحکام العدلیہ ' دفعہ ۳۶) یعنی رسم و رواج کو معاملات کا فیصلہ کرنے میں حکم قرار دیا جائے گا اور جن معاملات میں فیصلہ کا دارومدار حالات و زمانہ کی رعایت پر ہو وہاں مقامی رسم و رواج کو فیصلہ کن حیثیت دی جائے گی۔

۲۔ استعمال الناس حجة يجب العمل بها (مجلّہ الاحکام العدلیہ ' دفعہ ۳۷) یعنی لوگوں کا عمومی عمل خود ایک دلیل ہے جس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا جن معاملات میں شریعت کے بنیادی ماخذ (قرآن ' سنت' اجماع اور اجتہاد و قیاس) میں کوئی واضح رہنمائی نہ ملتی ہو ان میں معاملات کا فیصلہ کرتے وقت لوگوں کے رواج کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

۳۔ الحقيقة تترك بدلالة العادة (مجلّہ الاحکام العدلیہ ' دفعہ ۴۰) جہاں کسی دستاویز یا قانونی نکتہ کی وضاحت کے لئے ضروری ہو کہ وہاں کسی لفظ کے لغوی اور حقیقی معنی و مفہوم کی بجائے رواجی مفہوم لیا جائے تو رواجی مفہوم ہی مراد لیا جائے گا۔

یہ اور ان جیسے بہت سے قواعد و اصول فقہ اسلامی کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ ان میں وہ قواعد بھی شامل ہیں جو فقہ اسلامی کے تمام ابواب پر منطبق ہوتے ہیں اور وہ ابواب بھی شامل ہیں جو صرف

اسلام کے بین الاقوامی قانون پر لاگو ہوتے ہیں۔

۴۔ تحکیم کے فیصلوں سے مراد وہ فیصلے اور معاملات ہیں جن میں اسلامی ریاست اور کسی دوسرے گروہ کے درمیان کسی اختلافی یا نزاعی معاملہ کو تحکیم (یعنی Arbitration) کے سپرد کیا گیا ہو اور وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ ہوا ہو جس نے بین الاقوامی تعلقات کے کچھ نئے اصول یا جہتیں طے کی ہوں۔ آج کے سیاق و سباق میں بین الاقوامی عدالت انصاف کے فیصلوں، دیگر بین الاقوامی اداروں کی قرار دادوں اور کنونشنوں کو بھی اس ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور سنت میں حلف الفضول ان سب کی بنیاد ہے جس میں واضح طور پر یہ بات ارشاد فرمائی گئی کہ حق و انصاف اور عدل و مساوات کی بنیاد پر ہر بین الاقوامی فیصلہ اور انتظام مسلمانوں کو نہ صرف قبول کرنا چاہیے بلکہ ان کو آگے بڑھ کر اس میں فعال حصہ لینا چاہیے۔

۵۔ معاہدات کی پابندی اور قول کا پاس اسلام کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ اسلامی قانون ان تمام معاہدات اور معاہداتی التزامات (Contractual obligations) کو قبول کرتا ہے جو حدود شریعت سے متجاوز نہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان جو بھی شرائط اور معاملات کسی سے طے کریں گے ان کی پابندی کی جائے گی، ماسوائے ان شرائط کے جن سے شریعت کی طرف سے حرام قرار دیا ہوا کوئی فعل حلال قرار پا جائے اور شریعت کی طرف سے حلال قرار دیا ہوا کوئی فعل حرام قرار پائے۔

اس اصول کی بنیاد پر وہ تمام بین الاقوامی معاہدے مسلم ممالک کے لئے واجب التعمیل ہیں جن پر ان کے مجاز نمائندوں نے اپنی آزادانہ رائے اور رضامندی سے دستخط کئے ہوں اور وہ شریعت کے کسی اصول سے نہ ٹکراتے ہوں۔ ان معاہدوں میں دو فریقی اور کثیر فریقی ہر قسم کے معاہدے شامل ہوں گے اور ان میں بین الاقوامی تعلقات کے جو اصول طے کئے گئے ہوں گے وہ اسلام کے احکام کی رو سے جائز اصول ہوں گے۔

۶۔ مسلمان حکمرانوں اور فاتحین کے نظائر اور فیصلے اگرچہ براہ راست فقہ اسلامی کے احکام میں شامل نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کے ایک طے شدہ اور مقبول رواج کی بنیاد کے طور پر ان کی اپنی اہمیت ہے۔ خلفاء راشدین کے بیشتر فیصلے تو سنت ہی کا حصہ ہونے کی وجہ سے اسلامی قانون کے بنیادی ماخذ میں شامل ہیں، لیکن بعد کے حکمرانوں کے جائز فیصلے اور مقبول نظائر بھی اسلام کے بین الاقوامی تعلقات میں بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ امام مالک، امام اوزاعی اور دوسرے کئی فقہاء نے اپنی اپنی تحریروں میں ان حکمرانوں کے نظائر کا ذکر کیا ہے۔

۶۔ فقہ سیر کی قوت نافذہ

جدید مغربی بین الاقوامی قانون میں ایک بہت اہم بلکہ شاید سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیا بین الاقوامی قانون، قانون ہے بھی یا نہیں۔ مغربی مفکرین قانون اور قانون دانوں کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ ان کا بین

الاقوامی قانون سرے سے کوئی قانون نہیں ہے' اس لئے کہ اس کے پیچھے کوئی قوت نافذہ موجود نہیں ہے۔ مزید بر آں اس قانون میں قانون کے ضروری عناصر میں سے کوئی عنصر بھی نہیں پایا جاتا۔ نہ اس قانون کو کسی بالاتر قانون ساز نے بنا کر نافذ کیا ہے' نہ اس پر عمل درآمد کے لئے کوئی با اختیار قوت موجود ہے اور نہ کوئی ایسی بالا دست عدالت موجود ہے جو اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے سکے' لہٰذا اس قانون کو قانون کہنا مشکل ہے۔ جو حضرات یہ رائے رکھتے ہیں ان میں سے بعض اس کو بین الاقوامی اخلاق کا نام دینے پر اصرار کرتے ہیں۔ بعض کی رائے میں بین الاقوامی قانون اصول قانون کا نقطہ زوال ہے۔ کچھ اور مفکرین کے نزدیک بین الاقوامی قانون کو محض تکلفاً" ہی قانون قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس کے برعکس بعض دوسرے مفکرین کے نزدیک بین الاقوامی قانون ایک باقاعدہ قانون ہے جس میں وہ تمام ضروری لوازم پائے جاتے ہیں جو کسی حکم کو قانونی قوت اور قبولیت عطا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ مفکرین بین الاقوامی عدالت انصاف کے فیصلوں' بین الاقوامی معاملات سے متعلق مختلف معاہدوں اور ادارہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا ذکر کرتے ہیں جو مل جل کر بین الاقوامی قوانین کو یہ حیثیت عطا کر دیتے ہیں کہ وہ ایک باقاعدہ قانون قرار دیے جا سکیں۔

یہ ساری بحثیں صرف مغربی بین الاقوامی قانون پر لکھنے والوں کے ہاں پیدا ہوئی ہیں۔ اسلام کے قانون بین الاقوامی کے بارے میں یہ سوال کبھی پیدا نہیں ہوا کہ یہ قانون ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ ایک تو فقہاء نے اسے پہلے ہی سیر کہا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ ایک فقہ اسلامی (بالفاظ دیگر اسلام کے عمومی داخلی قانون Municipal Law کا ایک غیر منفک جزو (Integral part) ہے اور جس طرح ریاست کی ذمہ داری ہے کہ فقہ اسلامی کے دیگر ابواب و احکام پر عمل درآمد کرائے اس طرح اس کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ اسلام کے قانون بین الاقوام پر خود بھی عمل کرے اور ریاست کے شہریوں سے بھی کرائے۔ دوسرے جو قوت نافذہ اسلامی فقہ کے دوسرے شعبوں کی ذمہ دار ہے وہی سیر کے احکام پر عمل درآمد کراتی ہے' یعنی مسلمانوں کا ایمان و احساس جواب دہی۔ یہ داخلی قوت نافذہ ہی دراصل اسلام کے بین الاقوامی قانون پر عمل درآمد کئے جانے کی حقیقی ضمانت ہے۔

۷۔ اسلام کا تصور امت اور قومیت

اسلام میں جن چیزوں پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے ان میں پیغام اسلام کی عالم گیریت' امت مسلمہ کی بین الانسانیت اور مساوات آدم کے بنیادی تصورات ہیں۔ ان تمام تصورات میں مرکزی اور اساسی حیثیت امت یا امہ کے تصور کو حاصل ہے۔ اسلام نے علاقائی' لسانی' نسلی اور مبنی بر رنگ قومیتوں کے بجائے ایک بین الانسانی' جہانی اور عالمگیر امت کا تصور پیش کیا ہے جو اسلام کا سب سے بڑا اور اولین اجتماعی ہدف اور نصب العین ہے۔

اسلام نے ریاست کو نہیں امت کو مسلمانوں کا ملی نصب العین قرار دیا ہے۔ اسلام میں امت اصل مقصود اور ریاست اس کے تحفظ اور بقاء کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ فقہائے کرام کی اصطلاحی زبان میں امت کا وجود مطلوب اور ریاست کا وجود مطلوب لغیرہ ہے۔

اسلام میں بین الاقوامی قانون کے تمام احکام کی بنیاد اسلام کا تصور امت ہے۔ امت ہی کی بقاء اور تحفظ کے لئے ریاست قائم کی جاتی ہے اور امت ہی کے مقاصد و اہداف کی تکمیل کے لئے شریعت کا قانون عطا کیا گیا ہے رسول اللہ ﷺ کی پیدائش سے اڑھائی ہزار سال قبل جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے جلیل القدر فرزند سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام نے بیت اللہ --- دنیا کے اولین اور قدیم ترین مرکز توحید --- کی تعمیر کی تو دعا فرمائی کہ ان کی اولاد سے ایک امت مسلمہ پیدا ہو جو ایک رسول کی راہنمائی اور امامت میں کام کرے[۸]۔ قرآن پاک میں امت اور اس کی ذمہ داریوں کا ذکر درجنوں بار آیا ہے جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

امت مسلمہ کے بین الانسانی اور عالمی مقاصد ہی اسلام کے بین الاقوامی قانون کے مقاصد ہیں۔ اسلام کا بین الاقوامی قانون امت مسلمہ کی عالمگیریت کی تنظیم کرتا ہے۔ وہ امت مسلمہ کے قائدانہ کردار کو منضبط کرتا ہے۔ وہ اسلام کی بین الانسانیت کا فکری مظہر ہے۔ یہ اسلام کا بین الاقوامی قانون ہی تھا جس نے تاریخ اسلام کی ابتدائی کئی صدیوں تک دنیا کے سامنے اسلام کا عادلانہ اور رحمدلانہ کردار پیش کیا اور کروڑوں انسانوں کو اسلام کے دائرہ میں سمیٹ لیا۔

دور جدید کے تناظر میں اسلامی ریاست کے وجود کا سب سے اہم اور معرکہ الاراء مسئلہ تصور قومیت کا ہے۔ آج ریاست اور قومیت ہم معنی ہو گئے ہیں۔ مغرب میں نیشنل ازم کے فروغ اور وہاں نیشن اسٹیٹ کے ظہور نے پوری دنیا کی سیاسی تفکیر کو متاثر کیا ہے۔ خود دنیائے اسلام میں تعلیم یافتہ طبقہ کا ذہن ان تصورات سے اس طرح متاثر ہوا ہے کہ وہ مغرب کے رائج الوقت تصورات سے ہٹ کر کوئی بات ماننا اور اس پر عمل کرنا تو دور کی بات ہے، سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ صرف مغرب زدہ طبقہ ہی کی بات نہیں، اسلام کے علمبردار، احیائے اسلام کی باتیں کرنے والے اور اسلامی سیاست کے لیے کام کرنے والے بھی ان تصورات سے اتنے ہی متاثر ہیں جتنا کوئی بھی دوسرا شخص۔ ان حالات میں قومیت کے مغربی تصور کو عذاب دانش حاضر قرار دینا یقیناً ایک جہاد کبیر سے کم نہیں ہے۔

تاہم یہ خوشی کی بات ہے کہ اب مغرب میں قومیت کے تنگ نظریات کے بت آہستہ آہستہ کر کے ٹوٹ رہے ہیں۔ اشتراک نسل یعنی فرعونیت کی بنیاد پر جس قومیت کے ہٹلر اور مسولینی دعوے دار تھے اس کے خلاف خود مغرب میں ہی ایک دوسری اصلیت پر مبنی قومیت (یہودیت) کے علمبرداروں نے اتنا زور و شور سے پروپیگنڈا کیا کہ

وہاں ہٹلر اور مسولینی تو برائی کے رمز (سمبل) بن گئے' لیکن اشتراک نسل پر مبنی ان کا دیا ہوا تصور قومیت کسی نہ کسی رنگ میں ابھی تک چلا آ رہا ہے۔ اشتراک رنگ پر مبنی قومیت (اپارتھیڈ) کا فلسفہ ظاہر میں تو ختم ہو گیا لیکن اس کے پیدا کردہ تعصبات ابھی تک موجود ہیں۔ اشتراک زبان کو بھی اب مغرب نظر انداز کر رہا ہے۔ وہاں کثیر اللسانی قومیتیں نہ صرف موجود ہیں بلکہ ان کے تحفظ کی کوششیں تیز ہو رہی ہیں۔ امریکہ کے ہسپانوی اور کینیڈا کے فرانسیسیوں کی مثالیں اس باب میں بہت نمایاں ہیں۔

تاہم اب مغرب میں سب سے زیادہ زور اشتراک معیشت پر دیا جا رہا ہے۔ اور اسی بنیاد پر اب یورپ میں ایک اجتماعی قومیت جس کو یورپین نیشنلزم کہا جا سکتا ہے پروان چڑھائی جا رہی ہے۔ اب یورپ کے مختلف ممالک کی مشترکہ تہذیبی اقدار' مشترکہ مذہبی روایات اور مماثل سیاسی تصورات اور معاشی مفادات پر زور دیا جانے لگا ہے۔ یہ مشترک یورپی قومیت کے ابتدائی مظاہر ہیں۔ مشترک یورپی پاسپورٹ' مشترک یورپی کرنسی' مشترک یورپی مارکیٹ اور مشترک یورپی مواصلات سے بوسنیا اور ترکوں کو باہر رکھنے کی کاوشوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی تک مشترکہ یورپی قومیت کی اصل اساس مشترکہ مذہبی روایات اور تہذیبی اقدار ہی ہیں' اور یہی وہ بنیادی تصور ہے جس کا اسلام علمبردار ہے۔ جدید دنیائے اسلام بھی یورپین کمیونٹی کی طرز پر اسلامک کمیونٹی کی داغ بیل ڈال لے تو یہ دور جدید میں دارالاسلام کے ایک نئے انداز سے احیاء کے مترادف ہو گا۔

۸۔ اہل ذمہ اور غیر مسلم اقلیات

آج مغربی تصورات سیاست اور لادینیت کے اثر سے ہمارے ملک میں بھی یہ تصور عام ہوتا جا رہا ہے کہ سیاسی اور دستوری معاملات میں مذہب کا دخل ایک ناپسندیدہ چیز ہے۔ بہت سے مسلمان مذہب کی بنیاد پر کسی سیاسی تصور یا دستوری اصول کے بارے میں ناپسندیدگی کا رویہ نہ رکھنے کے باوجود اس بات میں الجھن محسوس کرتے ہیں کہ شہریت کے حقوق و فرائض یا بین الاقوامی تعلقات کے باب میں مذہبی اصولوں اور ہدایات سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ اس الجھن کا واحد سبب دور جدید کا وہ بے پناہ اور یک طرفہ پروپیگنڈا ہے جو مغربی سیکولرزم کے حق میں مسلسل دو سو سال سے کیا جا رہا ہے اور نت نئے انداز سے اس تصور کو اہل دنیا اور بالخصوص مسلمانوں کے ذہنوں میں بٹھانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ پروپیگنڈے کے اس طوفان کے مقابلہ میں اسلام کا موقف' اول تو پیش ہی نہیں کیا جا رہا اور اگر کہیں کہیں اس کی کوئی کوشش ہو بھی رہی ہے تو وہ بڑی کمزور اور غیر موثر ہے۔

اس ماحول اور ذہنی کیفیت میں جب ہم آج کے کسی تعلیم یافتہ شخص کے سامنے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اسلامی قوانین کی رو سے ریاست کے شہریوں کے حقوق کسی جغرافیائی حد' رنگ و نسل' جائے پیدائش یا زبان و قبیلہ کی بنیاد پر متعین نہیں ہوتے بلکہ نظریہ اسلام سے اس کی وابستگی اور رویہ کے حوالہ سے طے ہوتے ہیں تو بہت سے

لوگ اپنی جبینوں پر شکنیں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ اسلام نے اپنے روز آغاز ہی سے نہ صرف اپنی ریاست کے شہریوں کے حقوق و فرائض بلکہ مختلف ممالک کے بارہ میں اپنے رویہ اور تعلقات کی نوعیت کو اس واحد بنیاد پر طے کیا کہ ان کا رویہ اور طرز عمل اسلام کے بارے میں کیا ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے دیگر مذاہب وادیان کو پانچ زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ تقسیم ان مذاہب کی اسلام سے قربت یا دوری اور اس کی بنیاد پر مسلمانوں سے ان مذاہب کے پیروکاروں سے تعلقات کے پیش نظر کی گئی ہے۔

۱۔ اہل کتاب، یعنی یہودی اور عیسائی اور دیگر مذاہب جن کے اہل کتاب ہونے یا نہ ہونے کے بارہ میں فقہاء کرام اور محققین مختلف الرائے ہیں۔ مثلاً صابئین کے بارہ میں بعض فقہاء کا خیال ہے کہ وہ اہل کتاب میں شامل ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ شامل نہیں ہیں۔

۲۔ شبہ اہل کتاب، یعنی وہ مذاہب جن کے بعض عقائد اہل کتاب سے ملتے جلتے ہیں لیکن وہ کسی متعین کتاب کو حتمی طور پر کتاب الٰہی قرار نہیں دیتے جیسے مجوسی اور زرتشتی۔

۳۔ عام کفار، یعنی ایسے مذاہب کے پیرو جن کو آسمانی یا غیر آسمانی مذہب قرار دینا قطعیت کے ساتھ ممکن نہ ہو۔ جیسے بدھ مت، جین مت وغیرہ۔

۴۔ بت پرست اور مشرکین۔

۵۔ دہری، بے دین اور منکرین خدا۔

یہ تقسیم تو مختلف مذاہب کی اصل و آغاز اور تعلیمات کی نوعیت کے اعتبار سے تھی۔ دوسری تقسیم مسلمانوں سے ان کے روابط اور اسلامی ریاست میں ان کی حیثیت اور حقوق و فرائض کے اعتبار سے ہے۔

ا۔ حالت امن

۱۔ اہل عنوہ، وہ غیر مسلم جنہوں نے اسلامی ریاست سے جنگ کی ہو اور جن کے علاقے اسلامی ریاست نے جوابی فوجی کارروائی کے نتیجہ میں فتح کر لئے ہوں اور وہ اس فتح کے نتیجہ میں اسلامی ریاست کے شہری بن گئے ہوں۔

۲۔ معاہدین، وہ غیر مسلم جو کسی معاہدہ کے نتیجہ میں اسلامی ریاست کے شہری قرار پائے ہوں۔

۳۔ اہل صلح، وہ غیر مسلم جو کسی معاہدہ، اتفاق رائے یا کسی مصالحت کے نتیجہ میں اپنے علاقہ کے خود مختار اور آزاد شہری قرار پائے ہوں اور اسلامی ریاست سے ان کے تعلقات اس معاہدہ پر مبنی ہوں۔

۴۔ مستامنین، وہ اجنبی۔ مسلمان یا غیر مسلم۔ جو عارضی قیام کی نیت سے اجازت نامہ یا امان نامہ لے کر اسلامی ریاست میں داخل ہوں۔

ب۔ حالت جنگ

۱۔ اہل الحرب یا حربی۔ دشمن ملک کے وہ غیر مسلم شہری جو اسلامی ریاست سے برسر جنگ ہوں۔

۲۔ اہل البغی، وہ مسلمان یا غیر مسلم جو اسلامی ریاست کے شہری ہوں، جنہوں نے ریاست کی جائز حکومت یا جائز اور قانونی حکمران۔۔۔ امام عادل۔۔ کے خلاف بغاوت کر دی ہو اور قابل ذکر قوت بھی حاصل کر لی ہو۔

۳۔ محاربین، اسلامی ریاست کے وہ باشندے جو ریاست یا ریاست کے شہریوں کے خلاف قوت کا ناجائز استعمال کر کے کوئی ناجائز مفاد حاصل کرنا چاہتے ہوں، یعنی ڈاکو، راہزن وغیرہ۔

۴۔ مرتدین، یعنی اسلامی حکومت کے وہ مسلمان باشندے جو اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لیں اور پوری ریاست کی بنیادی اساس ہی کو چیلنج کر دیں۔

اس ایک تقسیم کے علاوہ ایک خصوصی قسم جزیرہ عرب کے مشرکین اور بت پرستوں کی بھی ہے۔ جن کے بارے میں قرآن پاک کی متعدد آیات اور کئی صریح احادیث کی بناء پر جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ ان کو اسلام، تلوار یا ملک بدری میں سے کسی ایک راستہ کو اختیار کرنے کا حکم تھا۔ ان کے لئے وہ رعائتیں نہیں تھیں جو دیگر غیر مسلموں کو دی گئی تھیں۔ مشرکین عرب کے ساتھ اس جداگانہ سلوک کے اسباب و علل پر بہت سے فقہاء کرام اور مفسرین نے روشنی ڈالی ہے۔ تفصیل کے لئے قارئین مولانا امین احسن اصلاحی کی کتاب اسلامی ریاست کے متعلقہ ابواب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

افراد اور گروہوں کے علاوہ فقہ اسلامی نے علاقوں کی تقسیم بھی نظریاتی بنیادوں پر کی ہے۔ چنانچہ دارالاسلام دارالحرب اور دارالعہد وغیرہ کی تقسیمیں اسی بنیاد پر ہیں۔ فقہائے اسلام نے عموماً دنیا بھر کے علاقوں اور ممالک کو اس بنیاد پر مختلف علاقوں (دار، جمع دور) میں تقسیم کیا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں سے ان کے تعلقات کس نوعیت کے ہیں۔ لہٰذا جو علاقہ یا علاقے مسلمانوں کے سیاسی اور انتظامی تصرف میں ہوں، وہاں مسلمانوں کو خود مختاری حاصل ہو، وہاں اسلامی شعائر کے اظہار پر کوئی پابندی نہ ہو اور جہاں اسلام کے قوانین و احکام نافذ ہوں وہ دارالاسلام کے علاقے کہلاتے ہیں۔ یوں تو فقہائے کرام نے دارالاسلام کی مختلف تعریفیں کی ہیں جن کے الفاظ اور عبارتیں بظاہر مختلف ہیں لیکن ان سب تعریفات میں جو مشترک تصور ملتا ہے وہ یہی ہے۔

نظری اعتبار سے دارالاسلام انتظامی طور پر مختلف ریاستوں اور انتظامی علاقوں میں تقسیم ہو سکتا ہے اور

دوسری صدی ہجری سے عملاً رہا بھی ہے، لیکن سیاسی اور آئینی طور پر اس کو ہمیشہ ایک ملی وحدت قرار دیا گیا۔ دنیا بھر کا ہر مسلمان مجرد مسلمان ہونے کی بنیاد پر دارالاسلام کی شہریت کا حقدار تھا اور اس کو پوری دنیائے اسلام میں اسی انداز کے حقوق اور مراعات حاصل تھے جو آج ایک یورپی ملک کے گورے مسیحی باشندے کو یورپی کمیونٹی میں حاصل ہیں یا ایک انگریز کو برطانوی دولت مشترکہ میں حاصل ہیں۔

اس کے مقابلہ میں دارالحرب سے مراد وہ علاقے تھے جن سے مسلمانوں یعنی دارالاسلام کا کوئی عارضی یا دائمی معاہدہ صلح یا امن بقائے باہمی کا کوئی بندوبست نہ ہو اور وہ نظری یا عملی طور پر دارالاسلام کے خلاف برسرجنگ ہوں۔ دارالحرب کے باشندوں کو عموماً حربی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور حربیوں سے تعلقات میں ان کا برسرجنگ ہونا یا ہو سکنا اصل بنیاد سمجھا جاتا تھا۔

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی ریاست کے غیر مسلموں سے تعلقات کا اصل دارومدار اسلام اور مسلمانوں سے ان کے تعلقات پر ہے۔ جو غیر مسلم مستقل طور پر اسلامی ریاست میں آباد ہوں ان کو بعض ایسے حقوق و مراعات حاصل ہیں جن کے تحفظ کی ذمہ داری اللہ اور رسول کے نام پر اسلامی ریاست لیتی ہے۔ ذمہ داری کی اس اہمیت کو نمایاں رکھنے اور اس کا احساس تازہ رکھنے کے لئے ایسے غیر مسلموں کو اہل ذمہ کے نام سے یاد کیا گیا یعنی وہ لوگ جن کے تحفظ کی ذمہ داری لی گئی ہے۔ اہل ذمہ کو عموماً دو زمروں یا کیٹگریز میں تقسیم کیا گیا ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے یعنی:

۱۔ اہل عنوہ یا مفتوحین

۲۔ اور معاہدین

ان میں سے اہل عنوہ اور مفتوحین کے حقوق فقہائے اسلام نے نسبتاً زیادہ تفصیل سے بیان کئے ہیں، اس لئے کہ یہ لوگ مفتوح قوم کے افراد ہونے کے باعث اپنے حقوق کا تحفظ کرنے کی زیادہ طاقت و ہمت نہیں رکھتے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اہل عنوہ یا مفتوحین وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کے خلاف اپنی پوری قوت میدان جنگ میں جھونک دی اور پھر شکست کھا کر مفتوح قرار پائے۔ ان لوگوں کو جو حقوق اور مراعات دی گئی ہیں وہ اسلامی شریعت کا حصہ ہیں جن پر عمل درآمد کرنا ریاست کے شہریوں اور کارپردازوں کے لئے اس طرح لازمی ہے جس طرح پنج وقتہ نماز کی ادائیگی یا اسلام کے دوسرے احکام پر عمل درآمد۔ یہ محض کسی ریاست کے کئے ہوئے رسمی اور زبانی اعلانات نہیں ہیں کہ آج ریاست ان کا اقرار کرلے اور کل موقع ملتے ہی ان سے پھر جائے۔

۱۔ جان و مال کا تحفظ۔ اہل عنوہ کے جان و مال کا تحفظ اسلامی ریاست کی اس طرح ذمہ داری ہے جس طرح مسلمانوں کے جو قوانین رائج ہیں وہ ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اسلامی ریاست

میں ایک شہری کی جان و مال کے تحفظ کے جو قوانین رائج ہیں وہ ریاست کے دیگر شہریوں کی طرح اہل عنوہ پر بھی لاگو ہوں گے اور قانون نے جو حقوق و مراعات دیگر شہریوں کو دیئے ہیں وہی اہل عنوہ کو بھی حاصل ہوں گے۔ اس بارے میں احادیث نبوی ﷺ اور اقوال صحابہ اتنی وضاحت اور کثرت سے موجود ہیں کہ ان کا یہاں حوالہ دینا طوالت کا باعث ہو گا[۹]۔

۲۔ عزت و آبرو کا تحفظ۔ اہل عنوہ کی عزت و آبرو اور ان کی اولاد اور اہل خاندان کی عزت و آبرو کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہے۔

۳۔ ان کے علاقہ کا دفاع اسلامی ریاست کی اسی طرح ذمہ داری ہو گی جس طرح دیگر مسلم اکثریت کے علاقوں کا دفاع۔

۴۔ ان کے شخصی قوانین میں اسلامی ریاست کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ اور اگر غیر مسلم اہل عنوہ اس کا مطالبہ کریں کہ ان کے اپنے قاضی یا نمائندے ان کے شخصی قوانین کے مطابق ان کے معاملات کا فیصلہ کریں تو ایسا بندوبست کرنا ریاست کی ذمہ داری ہو گی۔

۵۔ اہل عنوہ کو اپنے مذہبی معاملات میں مکمل آزادی ہو گی اور وہ قانون و اخلاق کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے مذہب پر عمل کرنے میں مکمل آزاد ہوں گے۔

۶۔ اہل عنوہ کے بوڑھوں، کمزوروں، بے روزگاروں، بیواؤں اور یتیموں کو بیت المال سے اسی طرح گزارہ الاؤنس لینے کا حق ہو گا جیسے مسلمان کو ہے۔

یہ وہ کم سے کم حقوق ہیں جو اہل عنوہ، مفتوحین اور تمام اہل ذمہ کو حاصل ہوں گے۔ ان حقوق کے مقابلہ میں اسلامی ریاست ان سے صرف تین چیزوں کا مطالبہ کرتی ہے۔

۱۔ وہ ریاست کے وفادار ہیں۔

۲۔ وہ اسلامی شریعت اور نظام کی بالادستی قبول کریں۔

۳۔ وہ ریاست کے مالی مطالبات پابندی سے ادا کریں۔

غیر مسلموں پر لگائے جانے والے ٹیکسوں یا مالی مطالبات کو جزاء یا جزیہ (بدلہ، معاوضہ) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ اس تحفظ کا بدلہ یا معاوضہ ہے جو ان کو ریاست نے فراہم کیا ہے۔ لیکن اس معاوضہ کی وصولی میں بھی یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ یہ صرف ان لوگوں سے وصول کیا جائے گا جو عاقل، بالغ، مرد، صحت مند اور مالدار ہوں اور مذہبی سرگرمیوں میں مصروف نہ ہوں۔ چنانچہ عورتوں، بچوں، بیماروں، کمزوروں، ناداروں اور مذہبی لوگوں سے یہ

مالی مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ مزید برآں اگر ریاست کسی وجہ سے کسی غیر مسلم فرد یا گروہ کو تحفظ فراہم نہ کر سکے تو اس کو اس معاوضہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔ تاریخ اسلام میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ غیر مسلموں سے ایک بار جزیہ کا ٹیکس وصول کر کے محض اس لئے یک طرفہ طور پر اس کی واپسی کا حکم دے دیا گیا کہ ریاست نے محسوس کیا کہ وہ ان کو تحفظ فراہم نہیں کر پائی۔ حضرت خالد بن ولید نے جب حیرہ کے باشندوں کو امان دی تو ان کو جو تحریر حضرت ابو بکر صدیقؓ کی منظوری سے لکھ کر دی اس میں لکھا تھا ان منعناکم فلنا الجزیۃ والا فلا حتی نمنعکم اگر ہم تمہارا تحفظ اور دفاع کر سکے تو جزیہ ہمارا حق ہے ورنہ نہیں[۱۰]۔

اگر اہل ذمہ ریاست کے دفاع میں خود شریک ہوں تو ان کو جزیہ ٹیکس سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا عذر مثلاً بیماری، بیروزگاری وغیرہ جس کی وجہ سے وہ یہ ٹیکس نہ دے سکتے ہوں، کسی غیر مسلم کو پورے سال جاری رہے تو اس کو بھی ٹیکس سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے[۱۱]۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جوں ہی کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرنے کا اعلان کرے تو فوراً اس پر واجب الادا جزیہ کی رقم معاف کر دی جائے گی۔

اس کے مقابلہ میں مسلمان شہریوں سے جو لازمی مالی مطالبات (مثلاً زکوٰۃ وغیرہ) وصول کئے جائیں گے ان میں کوئی استثناء نہیں ہو گا۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کا جان و مال کے تحفظ یا عدم تحفظ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا بیماری، یا بے روزگاری سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ اگر زکوٰۃ واجب الادا ہے تو وہ ہر صورت میں دینی پڑے گی۔ اس طرح عورتوں اور مذہبی لوگوں کو بھی زکوٰۃ سے کوئی استثناء حاصل نہیں ہو گا۔

یہ تو وہ حقوق تھے جو مفتوحین اور اہل عنوہ کو حاصل تھے۔ جہاں تک معاہدین کا تعلق ہے تو ان کی کم سے کم شرائط اور مراعات تو یہی ہوں گی جو بیان ہوئیں، لیکن اگر وہ حکومت وقت سے کوئی مزید مراعات حاصل کرنا چاہیں تو وہ معاہدہ کی تفصیلات کے مطابق ان کو دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ان کو جزیہ ٹیکس سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ ان کو مزید داخلی خودمختاری دی جا سکتی ہے۔ وہ بدستور اپنی زمینوں اور جائیدادوں کے مالک رہیں گے اور دوسرے شہریوں کی طرح مالیہ ادا کریں گے۔

۹۔ مستامنین

مستامن سے مراد وہ غیر ملکی شہری ہے جو عارضی طور پر اجازت نامہ (امان) Viza لے کر دارالاسلام میں داخل ہوا ہو۔ اگرچہ مستامن مسلمان بھی ہو سکتا ہے لیکن عموماً اس سے مراد غیر مسلم اجنبی ہی لیا جاتا ہے۔ مستامن کے لغوی معنی امان طلب کرنے والے کے ہیں۔ اس کی بنیاد سورہ توبہ کی اس آیت پر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی مشرک تم سے پناہ طلب کرے تو اس کو پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام اور پیغام سن سکے، پھر اس کو اس کی جائے امن تک پہنچا دو[۱۲]۔

مستامن اور ذمی دونوں کے بہت سے احکام ملتے جلتے ہیں۔ دونوں کو دارالاسلام میں رہنے کی اجازت (امان) حاصل ہوتی ہے' دونوں کو اسلامی ریاست کے بنیادی قانون--- شریعت--- کی بالادستی قبول کرنی پڑتی ہے' دونوں کو کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں اور دونوں کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی ریاست لیتی ہے۔ لیکن مستامن اور ذمی میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ مستامن کا امان نامہ (اجازت نامہ) عارضی ہوتا ہے جبکہ ذمی کا امان نامہ دائمی ہوتا ہے۔ مستامن کو دی جانے والی عارضی امان کی بھی دو قسمیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ خاص امان یا خصوصی امان جو خاص حالات میں دی جائے

۲۔ عام یا عمومی امان جو عام حالات میں دی جائے۔

خاص حالات سے مراد حالت جنگ کے دوران پیش آنے والے ایسے خصوصی حالات ہیں جن میں دشمن کے کسی سپاہی یا سپاہیوں کو امان دینے کی ضرورت پیش آ جائے۔ یہ امان ہر مسلمان سپاہی دے سکتا ہے۔ اس لئے کہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: المسلمون تتاکافوا دماوھم ویسعی بذمتھم ادناھم یعنی مسلمانوں کے خون ایک دوسرے کے برابر ہیں اور ان کی طرف سے ان کا معمولی شخص بھی ذمہ داری لے سکتا ہے۔ اسی اصول کے تحت رسول ﷺ نے فتح مکہ کے موقعہ پر ام ہانی کی دی ہوئی امان کو تسلیم کیا اور فرمایا قد اجرنا من اجرت جس کو تم نے امان دی اس کو ہم نے بھی امان دی۔

تاہم اس باب میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے کہ کیا مسلمان فوج کا کوئی غیر مسلم (ذمی) سپاہی بھی یہ امان دے سکتا ہے؟ عام حالات میں فقہاء کرام متفق اللفظ ہیں کہ غیر مسلم یہ امان نہیں دے سکتا۔ اس لئے کہ مذکورہ حدیث میں جس کی بنیاد پر یہ اجازت عام سپاہی کو ملی ہے صرف مسلمانوں کا ذکر ہے' لہٰذا غیر مسلم سپاہیوں پر ان کا اطلاق نہیں ہو سکتا' یہ رائے حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی' جعفری' زیدی تمام فقہاء کی ہے۔ البتہ اگر مسلم فوج میں شامل غیر مسلموں کو اسلامی حکومت کی طرف سے اس کی اجازت دے دی گئی ہو کہ وہ دشمن فوج کے کسی سپاہی کو امان دے سکتے ہیں تو پھر امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایک غیر مسلم سپاہی بھی امان دے سکتا ہے۔

بعض فقہاء کرام نے ایک مزید شرط یہ بھی بیان کی ہے کہ ایک عام سپاہی کی دی ہوئی امان اس وقت جائز اور قابل قبول مانی جائے گی جب اس میں مسلمانوں کا عمومی طور پر کوئی نقصان نہ ہو یا ایسا کرنا ریاست کی کسی مصلحت یا مفاد کے خلاف نہ ہو۔ یہ ایک ایسی شرط ہے جس کے ضروری اور مفید ہونے میں تو دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اس کی شرعی بنیاد پر مالکی اور غیر مالکی فقہاء میں بڑے مباحث ہوتے رہتے ہیں۔ اسی بنیاد پر مالکی فقہاء میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ امان دینا دراصل حکومت وقت یا امام مسلمین کا حق ہے' عامۃ الناس کو از خود امان دینے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ اگر امام ان کو ایسا کرنے کی اجازت دے تو وہ اس حق کو استعمال کر

سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ بلکہ امام (یعنی سربراہ مملکت) کی طرف سے اجازت کی صورت میں بھی وہ انفرادی معاملات پر نظر ثانی کرنے اور ان کو منسوخ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہ مالکی فقہاء امان کے بارہ میں مذکورہ بالا احادیث کی تفسیر یہی کرتے ہیں کہ حکومت کی اجازت سے ہر شہری اس حق کو استعمال کرنے میں برابر ہے۔

عام امان یا عمومی امان وہ ہے جو عام حالات میں دی جائے۔ اس امان کے بارہ میں اگرچہ حنفی فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ امان بھی کوئی عام مسلمان دے سکتا ہے لیکن دیگر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ امان دینے کا اختیار صرف حکومت وقت یا امام مسلمین کو حاصل ہے۔ عام حالات میں جو امان دی جائے گی وہ کسی فرد کو دی جائے یا گروہ کو وہ جمہور فقہاء کے نزدیک اس وقت تک جائز اور قابل قبول نہ ہو گی جب تک وہ حکومت وقت یا امام مسلمین یا اس کے نمائندہ مجاز نے نہ دی ہو۔ دور جدید کے بہت سے فقہاء کا خیال ہے کہ اس دور کے حالات میں حنفی فقہاء کی بجائے دوسرے فقہاء کا اجتہاد زیادہ موزوں اور مبنی بر مصلحت معلوم ہوتا ہے۔ یہی رائے مشہور عرب فقیہ استاذ عبدالکریم زید ان کی بھی ہے [۱۳]۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ذمی اور مستامن کے بہت سے احکام ملتے جلتے ہیں۔ اور بعض مستثنیات کے ساتھ دونوں کی حیثیت اسلامی ریاست میں یکساں ہے۔ یکسانیت کے اس اصول کو امام سرخسی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے المستامن بمنزلۃ اھل الذمۃ فی دارنا یعنی مستامن جب تک ہمارے علاقہ میں ہے وہ بمنزلہ اہل ذمہ کے ہے۔ اس کے حقوق، مراعات، ذمہ داریاں سب اہل ذمہ سے ملتی جلتی ہوں گی۔ اس کے جان و مال کا تحفظ ریاست اسی طرح کرے گی جس طرح اہل ذمہ کا کرتی ہے۔ اس کی مذہبی آزادی اور شخصی قوانین میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ اس کی عزت و آبرو کو وہی تحفظ حاصل ہو گا جو ریاست کے اپنے شہریوں کو ہوتا ہے۔ البتہ مستامن سے جزیہ ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا اور اس سے وصول کی جانے والی کسٹم ڈیوٹی (عشور) ذمی سے لی جانے والی کسٹم ڈیوٹی سے کم و بیش ہو سکتی ہے۔

جن اسباب سے اہل ذمہ کی شہریت ختم ہو سکتی ہے انہی اسباب سے مستامن کی امان بھی ختم ہو سکتی ہے اس کے علاوہ وہ دار الحرب واپس چلا جائے یا حکومت پیشگی نوٹس کے ذریعہ اس کی امان ختم کر دے تو مستامن کی امان ختم ہو جائے گی۔ فقہاء نے نسخ امان کے دیگر عمومی اسباب میں درج ذیل اسباب خاص طور پر بیان کئے ہیں۔

۱۔ جس مدت کے لئے امان لی تھی وہ ختم ہو جائے تو امان خود بخود ختم ہو جائے گی اور مستامن کو اپنے وطن واپس جانا پڑے گا۔ بعض فقہاء کے نزدیک یہ مدت زیادہ سے زیادہ چار ماہ اور بعض کے نزدیک ایک سال ہو سکتی ہے۔

۲۔ جن شرائط پر امان دی گئی تھی ان کی خلاف ورزی کرنے پر امان ختم ہو جائے گی۔

۳۔ جعلی دستاویزات پکڑے جانے پر۔

۴۔ دفاعی معاملات کے لئے خطرہ ثابت ہونے پر۔

۵۔ دشمن کے لئے جاسوسی کے ارتکاب پر۔

ان کے علاوہ دیگر جرائم کے ارتکاب سے امان فسخ نہیں ہو گی بلکہ متعلقہ جرم کی سزا اسلامی قانون کے مطابق دی جائے گی۔ اگر کوئی مستامن دارالاسلام میں ارتکاب جرم کر کے فرار ہو جائے تو جب بھی وہ دارالاسلام میں آئے گا اس پر مقدمہ چلا کر اس کو اس جرم کی سزا دی جائے گی۔ البتہ اگر وہ دارالحرب میں کسی جرم کا ارتکاب کر کے آیا ہو تو عام حالات میں دارالاسلام کی عدالتیں اس کے خلاف مقدمہ کی سماعت نہیں کریں گی۔

۱۰۔ اسلام کا تصور جہاد اور قانون جنگ

جنگیں اتنی ہی قدیم ہیں جتنا خود انسان قدیم ہے۔ لیکن جنگوں سے بچنے اور انسانی اختلافات پر امن طریقہ سے طے کرنے کی کوششیں بھی کم قدیم نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر مذہب اور نظام میں ریاست کی طاقت کو اخلاقی اصول و ضوابط کے تحت منضبط کرنے کی کوششیں ہمیشہ کی جاتی رہی ہیں۔ یہ کوششیں ریاستوں اور مملکتوں کے داخلی قوانین اور داخلی امور میں بھی کی گئیں اور خارجی تعلقات' بیرونی امور اور بین الاقوامی قوانین کے تحت بھی ہوتی رہیں۔ لیکن شاید انسانی قوانین کے کسی اور جزو کی اتنی کم نہیں تعمیل کی گئی جتنی بین الاقوامی قوانین کے ان حصوں کی جن کا مقصد جنگوں کو روکنا اور قوموں کے بین الاقوامی اختلافات کو پر امن طریقہ سے حل کرانا تھا۔ اس عدم تعمیل میں دور جدید کے مہذب اور ترقی یافتہ ممالک اور دور قدیم کے غیر متمدن اور وحشی سب برابر ہی نظر آتے ہیں۔

اس عدم تعمیل کی ایک جزوی وجہ شاید مختلف قوانین جنگ اور نظامہائے قانون کا غیر متوازن اور غیر عقلی ہونا بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ قوانین جنگ کے باب میں تورات کی سختی اور انجیل کی نرمی ضرب المثل ہے۔ یہی عدم توازن دوسرے قوانین جنگ میں بھی نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام نے پہلے ہی دن سے اعتدال اور توازن کی تعلیم دی۔ پیغمبر اسلام نے جہاں اپنے کو نبی رحمت کے طور پر متعارف کرایا۔ وہاں خود کو پیغمبر جنگ بھی قرار دیا۔ آپؐ نے فرمایا انا نبی المرحمة انا نبی الملحمة یعنی میں رحمت کا بھی نبی ہوں اور میں جنگ کا بھی نبی ہوں۔ ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا: فالضحوک القتال میں مسکراہٹیں دینے کے ساتھ ساتھ ضرورت کے موقع پر جنگ بھی کرتا ہوں۔

رحمت و شفقت کے ساتھ جنگ کی اجازت اور قوت کے استعمال کی ضرورت کا اعتراف اسلام کا ایک امتیازی وصف ہے۔ اسی وصف کو حضور علیہ السلام نے زروۃ سنام سے تعبیر فرمایا یعنی جس طرح اونٹ کا کوہان اس

کا سب سے امتیازی عضو اور علامت ہوتا ہے اس طرح جہاد اور تلوار کا استعمال اسلام کا امتیازی وصف ہے۔ اسلام محض کوئی علمی خیالی آرائی نہیں ہے۔ یہ ایک جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ اسلام کی مذہبیت اور روحانیت کا مطلب کوئی منفی فراریت نہیں ہے بلکہ یہ ایک مثبت فعالیت ہے جس کا ہدف انسانی زندگی میں ایک مثبت' بامقصد سمت اور تعمیری تبدیلی لانا ہے۔ اسلام کا تصور جہاد دراصل وہ قوت نافذہ ہے جو اسلام کے پیغام کو زندگی عطا کرتا ہے۔ یہ وہ قوت بازو ہے جس سے وحدت اسلام کے تحفظ کی ضمانت ملتی ہے۔ اسلام حقائق زندگی کا اعتراف کر کے ان کا حل پیش کرتا ہے' وہ کوئی ایسا طلسم افلاطونی نہیں جس کی اساس ابدی حقائق پر نہ ہو۔

جہاد کی اسی اہمیت کے پیش نظر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے: ان اتم الشرائع واکمل النوامیس الشرع الذی یومر فیہ بالجہاد یعنی سب سے کامل نظام قانون اور سب سے مکمل مذہبی پیغام وہ ہے جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہو[۱۴]۔ فقہائے اسلام نے جہاد کو دینی مقاصد کے حصول کا ایک لازمی وسیلہ قرار دیا ہے' مشہور شافعی فقیہ علامہ محمد خطیب الشربینی لکھتے ہیں کہ جہاد کی فرضیت اس لئے نہیں ہے کہ وہ خود کوئی ہدف' یا مقصود بالذات ہے' بلکہ اس لئے ہے کہ وہ ایک ہدف اور مقصود کو حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ اس لئے کہ جہاد کا ہدف یہ ہے کہ دنیا میں ہدایت الٰہی عام ہو' کفار کا قتل مقصود نہیں ہے' بلکہ ان کی ہدایت مطلوب ہے۔ لہٰذا اگر بغیر کسی جہاد کے محض دلیل ہی سے ہدایت حاصل ہو جائے تو یہ جہاد سے بھی بڑھ کر ہے[۱۵]۔

عربی زبان میں جہاد سے مراد ایسی مسلسل جدوجہد اور کوشش پیہم ہے جس کا مقصد اللہ کے دین کی سر بلندی ہو۔ امام راغب اصفہانی نے' جو قرآن کے مشہور لغت نویس ہیں' لکھا ہے کہ جہاد بعض اوقات کھلے دشمن کے ساتھ میدان جنگ میں ہوتا ہے۔ یہ جہاد کی سب سے اہم اور سب سے بڑی قسم بلکہ سب سے آخری مرحلہ اور آخری چارہ کار ہے۔ بعض اوقات جہاد شیطان اور شیطانی قوتوں کے خلاف ہوتا ہے۔ اس میں انسانوں کی صورت میں پائے جانے والے شیاطین بھی شامل ہیں جو انسان کو بدی کی راہیں سمجھاتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات جہاد خود انسان کے اپنے نفس کے خلاف ہوتا ہے جو ہر وقت انسان کو غلط رجحانات اختیار کرنے اور غلط راستوں پر چلنے پر اکساتا رہتا ہے۔ اس جہاد کے لئے بعض اوقات مجاہدہ کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالقرآن بھی ہے جس کے معنی ہیں قرآن کے پیغام کو عام کرنے اور اس پر ایمان لانے کی کوشش اور جدوجہد[۱۶]۔

ان میں سے پہلی قسم وہ ہے جس پر فقہ اسلامی میں بحث کی جاتی ہے۔ بقیہ اقسام سے علم عقائد یا تزکیہ و احسان کے ابواب میں بحث ہوتی ہے۔ فقہی اعتبار سے جہاد کی تعریف جو مشہور حنفی فقیہ علامہ علاء الدین کاسانی نے کی ہے' یہ ہے۔ الجہاد بذل الوسع والطاقۃ فی سبیل اللہ بالنفس والمال واللسان یعنی جان' مال اور زبان سے اللہ کے رستہ میں ہر قسم کی قوت اور استطاعت کو کھپا دینا اور خرچ کر ڈالنا۔

جان و مال اور زبان سے اپنی ہر قوت اور طاقت کو اللہ کے راستہ میں استعمال کرنے کا یہ عمل ایک ایسی کوشش پیہم سے عبارت ہے جس سے بری الذمہ ہو جانے کا کوئی تصور اسلام میں نہیں ہے۔ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا۔ جس دن سے اللہ نے مجھے بطور نبی مبعوث فرمایا ہے اس دن سے جہاد جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب میری امت کے آخری لوگ دجال سے جنگ کریں گے۔ یہ نہ کسی ظالم فرمانروا کے ظلم کی وجہ سے معطل ہو گا نہ کسی عادل حکمران کے عدل کی وجہ سے غیر ضروری قرار پائے گا۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ جہاد کا یہ عمل ہجرت سے تیرہ سال پہلے اسلام کے روز آغاز سے جاری تھا اور تا قیام قیامت جاری رہے گا۔ اس کو نہ تو یہ کہہ کر معطل کیا جا سکتا ہے کہ حکومت غلط لوگوں کے ہاتھ میں ہے لہٰذا نالائق حکمرانوں کی سرکردگی میں جہاد نہیں ہونا چاہیے اور نہ یہ کہہ کر ختم کیا جا سکتا ہے کہ اب فلاں علاقہ میں اسلام کا عادلانہ نظام قائم ہو گیا لہٰذا اب جہاد کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد جو پہلا خطبہ دیا تھا اس میں فرمایا تھا کہ تم میں سے کوئی شخص جہاد کو نہ چھوڑے۔ اس لئے کہ جو قوم جہاد کو ترک کر دیتی ہے اللہ تعالیٰ اس پر ذلت و ادبار مسلط کر دیتا ہے۔ یہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھی کہ جو قوم خود پیش قدمی کرنے کے بجائے دوسروں کو اپنے گھر میں آکر حملہ آور ہونے کا موقع دیتی ہے وہ ذلیل ہو جاتی ہے۔

اگرچہ جہاد کا عام فہم مفہوم قتال فی سبیل اللہ ہی ہے لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا قرآن پاک اور احادیث نبوی میں یہ اصطلاح ایک ہمہ گیر اور مسلسل جدوجہد کے مفہوم میں استعمال کی گئی ہے۔ قرآن پاک کی مکی سورتوں میں جہاں جہاد کا ذکر آیا ہے وہاں ظاہر بات ہے کہ اس سے مراد وہ قتال بالسیف نہیں لیا جا سکتا جس کی اجازت ہجرت کے بعد سنہ ۲ ہجری کے اوائل میں دی گئی۔ چنانچہ سورہ فرقان کی آیت مبارکہ وجاھدھم بہ جھادا کبیرا (اور اے پیغمبر اس قرآن کے ذریعہ ان لوگوں کے مقابلہ میں بڑی جدوجہد کیجئے)۔ اسی طرح احادیث نبوی اور اقوال صحابہ میں بھی متعدد مقامات پر جہاد کو اسی عمومی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔

اس طرح اسلام نے جنگ کو محض اظہار قوت، ہوس ملک گیری اور کسب مال کے مادی محرکات سے الگ کر کے ایک بڑے اور اعلیٰ وارفع مقصد سے وابستہ کر دیا۔ اب جنگ بذات خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ جہاد فی سبیل اللہ کے عمومی اور ہمہ گیر مقصد کا باب یا مرحلہ ہے جس کا بنیادی اور اولین ہدف ان مقاصد کا حصول ہے جو جہاد کے مقاصد ہیں یعنی دنیا میں اللہ کا پیغام امن و مساوات اور اسلام کا نظریہ عدل و انصاف پھیلانا اور اس کو عملاً قائم کرنے کی جدوجہد کرنا۔ اس جدوجہد کے راستہ میں بسا اوقات بڑے بڑے مشکل مقامات بھی آتے ہیں۔ ان سے گزرنے اور کامیابی سے گزرنے کے لئے صبر و استقلال اور عزم و ثبات کی جا بجا تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن صبر و

استقلال اور عزم و ثبات کے باوجود ایسے مراحل آجاتے ہیں جب تلوار اٹھا لینے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا یہ وہ وقت ہوتا ہے جب جدوجہد ایک فیصلہ کن اور آخری مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

اس آخری اور فیصلہ کن مرحلہ ہی کو جہاد کی سب سے اعلیٰ اور ارفع قسم اور اسلام کا طرہ امتیاز قرار دیا گیا ہے۔ امام سرخسی نے لکھا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان پرامن طریقہ سے اپنی دینی اور دنیوی ذمہ داریوں کو انجام دے سکیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک مسلمان پر امن طریقہ سے اپنے دین کے تقاضوں پر عمل پیرا رہیں ان کو تلوار اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ ایک دوسرے فقیہ علامہ کمال بن ہمام نے لکھا ہے کہ جہاد (قتال) کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کو فساد سے پاک کیا جائے۔ جہاد کو اسی لئے فرض کفایہ قرار دیا گیا ہے کہ اگر سب لوگ اپنی اپنی ذمہ داریاں چھوڑ کر جنگ میں لگ جائیں تو بقیہ کام کیسے ہوں گے۔ اس لئے جب تک کوئی ناگزیر ہنگامی صورت حال نہ ہو جہاد میں حصہ لینے کے لئے تعلیم، زراعت، صنعت، علاج اور تیمارداری، گھریلو زندگی کی ذمہ داریاں اور اس طرح کے دوسرے شعبے نظرانداز نہ کئے جائیں اور اس کا اہتمام کیا جائے کہ یہ شعبے کام کرتے رہیں۔

فقہائے اسلام نے عموماً جنگوں کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔

۱۔ کفار یعنی بیرونی دشمنوں سے جنگ اور

۲۔ داخلی مخالفین سے جنگ۔

اس دوسری قسم کو حرب المصالح کا نام دیا گیا ہے، یعنی ریاست کے داخلی مفاد کے تحفظ کی خاطر جنگ جو باغیوں، مفسدوں، ڈاکوؤں، راہزنوں اور مرتدوں سے کی جاتی ہے۔ جنگوں کی یہ دوسری قسم عام طور پر بین الاقوامی قانون کا موضوع نہیں سمجھی جاتی لیکن فقہائے اسلام نے اس کو بھی سیر کا موضوع قرار دیا ہے۔ بیرونی دشمنوں سے جنگ کی جو صورتیں اسلام نے جائز قرار دی ہیں ان کو درج ذیل قسموں کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جارحیت کے جواب میں کی جانے والی جنگ۔ قرآن پاک نے ۱۸ ظلم و زیادتی کے خلاف اور اپنا دفاع کرنے کے لئے تلوار اٹھانے کی اجازت دی ہے۔ ظلم کا مقابلہ کرنا اور قوت اور وسائل اجازت دیں تو ظالم کو طاقت سے روک دینا جہاد بالسیف کی سب سے پہلی قسم ہے۔ قرآن پاک کی متعدد آیات میں جنگ کی اس قسم کو ایک جائز اور مبنی بر انصاف اقدام قرار دیا ہے۔ عہد نبوی کے غزوات میں غزوہ احد اور غزوہ احزاب دفاعی جنگ کی سب سے بڑی نمایاں مثالیں ہیں۔

۲۔ دعوت اسلامی کے راستہ میں حائل رکاوٹوں اور فتنہ و فساد کو ختم کرنے کے لئے جنگ۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا۔ اس وقت تک ان لوگوں (راستہ روکنے اور فتنہ پردازی کرنے والوں) سے جنگ کرو جب تک کہ فتنہ ختم نہ ہو اور دین سارا کا سارا اللہ ہی کا نہ ہو جائے۔ لہٰذا اگر یہ لوگ (فتنہ پردازی سے) باز آجائیں

تو پھر صرف ظالموں ہی کے خلاف زیادتی کی اجازت باقی رہ جاتی ہے[۱۹]۔

۳۔ سابقہ جنگ کے تسلسل کے طور پر لڑی جانے والی جنگ۔ قرآن پاک میں سابقہ جنگوں کے حوالہ سے ایک جگہ فرمایا گیا۔ کیا تم اس گروہ سے جنگ نہیں کرتے جنہوں نے اپنے عہدو پیمان توڑ ڈالے اور رسول کو نکال دینے کا ارادہ کر لیا اور انہوں نے ہی پہلی بار تم سے جنگ شروع کی[۲۰]۔ عہد نبوی کے غزوات میں تبوک اور خیبر اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

۴۔ مسلم اقلیتوں اور معاہدین کے تحفظ اور دفاع کے لئے کی جانے والی جنگ قرآن مجید نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اگر کسی پڑوسی غیر مسلم ملک میں مسلمانوں پر مظالم ہو رہے ہوں اور وہ مسلمان اسلامی ریاست سے مدد طلب کریں تو اگر اسلامی ریاست اور اس غیر مسلم ملک کے درمیان کوئی معاہدہ مانع نہ ہو تو اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ مسلم اقلیت کی مدد کرے اور اس کے جائز حقوق کے لئے جنگ کرنا پڑے تو جنگ کرے[۲۱]۔ اسی طرح اگر کسی غیر مسلم گروہ سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو جس کی رو سے وہ اسلامی ریاست کے شہری یا زیر حفاظت قرار پائے ہوں تو ان کے دفاع کے لئے جنگ کرنا بھی اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

۵۔ پیش بندی کے طور پر کی جانے والی جنگ۔ دفاع کے معنی صرف دشمن کا انتظار کرنے اور موقع ملنے پر تلوار اٹھانے کے نہیں ہیں بلکہ مناسب اور جائز پیش بندی (جس سے کسی معاہدہ یا وعدہ کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو) بھی دفاع میں شامل ہے۔ غزوہ بدر ایسی ہی پیش بندی کی نمایاں مثال ہے۔ یعنی دشمن کی عسکری تیاریوں کو روک دینا اور اقدام کے موقع سے محروم کر دینے کے منصوبہ بندی پہلے سے کر کے اس پر موقع آنے پر عمل کرنا۔

۶۔ معاقبانہ (Punitive) اقدام کے طور کی جانے والی جنگ۔ بعض اوقات دشمن کی سازشوں، عہد شکنیوں اور دیگر دشمنوں سے ساز باز سے روکنے کے لئے فوجی اقدام (ملٹری ایکشن یا پولیس ایکشن) ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر نہ امن و امان قائم ہوتا ہے اور نہ فتنہ پردازی ختم ہوتی ہے۔ بنو قریظہ اور بنو نضیر کے یہودیوں اور قریش مکہ کے خلاف اقدامات اسی نوعیت کے تھے۔ ان اقدامات کے نتیجہ میں مدینہ منورہ یہودیوں کی سازشوں سے اور مکہ مکرمہ کفار و مشرکین کے قبضہ سے پاک ہو گئے۔

مقصد جنگ اور محرک جنگ میں اصلاح کے ساتھ ساتھ اسلام نے خود عمل جنگ میں بھی اصلاحات کیں، وہ اصلاحات جن سے دنیا نہ صرف اسلام سے پہلے نامانوس تھی بلکہ آج بھی نامانوس معلوم ہوتی ہے۔ یہاں ان تمام اصلاحات کا احاطہ کرنا تو مشکل ہے البتہ مختصر طور پر ان کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان اصلاحات کا ذکر کرنے سے قبل

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ان ہدایات کی طرف اشارہ کیا جائے جو آپ ﷺ اپنے فوجی کمانڈروں کو دیا کرتے تھے۔ آپؐ کے اس ہدایت نامہ کو امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی اور کئی دوسرے آئمہ حدیث نے روایت کیا ہے۔ امام محمد بن الحسن الشیبانی نے اپنی دونوں کتابوں کتاب السیر الکبیر اور کتاب السیر الصغیر کا آغاز بھی اسی ہدایت نامہ سے کیا ہے۔

"روایت ہے کہ جب حضور علیہ السلام کوئی فوجی دستہ روانہ فرماتے تو اس کو بہت سی ہدایات دیتے جن میں درج ذیل ہدایات بھی شامل ہوتی تھیں:

۱۔ دوران جنگ سرکاری خزانہ اور سازو سامان اور بالخصوص مال غنیمت میں گڑبڑ نہ کرنا۔

۲۔ دشمن سے کسی صورت بھی بدعہدی اور خیانت نہ کرنا۔

۳۔ دشمن کے مقتولوں کا مثلہ مت کرنا (یعنی مردہ کی لاش کو نہ بگاڑنا)۔

۴۔ کسی بچہ کو قتل نہ کرنا۔

۵۔ کسی عورت کو مت قتل کرنا۔

۶۔ میدان جنگ میں بھی جنگ شروع کرنے سے قبل ایک بار پھر دشمن کو قبول اسلام یا اسلامی ریاست کی سیاسی اور آئینی بالادستی قبول کرنے کی دعوت دے کر جنگ کو ٹالنے کی کوشش کرنا"۔

اصلاحات جنگ پر اسلام کی تعلیمات کو سہولت کی خاطر چار عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مباحات جنگ

۲۔ منہیات جنگ

۳۔ حقوق مقاتلین

۴۔ نتائج جنگ

مباحات جنگ میں وہ امور شامل ہیں جو عام حالات میں تو ناجائز یا مکروہ ہیں لیکن ایک ایسی جنگ میں جو شرعاً جائز ہو اور جس میں جہاد کی جملہ شرائط پوری ہوتی ہوں، ناگزیر جنگی ضروریات کے تحت ضرورت کی حد تک ان کو کرنے کی اجازت ہے۔ اس ضمن میں سب سے اہم چیز تجارت پر بعض پابندیاں ہیں۔ عام حالات میں تاجروں کو بہت سے معاملات اور متعدد قسم کے کاروبار کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ وہ جو سامان خریدنا اور فروخت کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن دوران جنگ اگر حکومت مناسب اور ضروری سمجھے تو ایسے سامان کی آمدورفت اور خرید و فروخت پر پابندی لگا سکتی ہے جس سے دشمن کو فائدہ یا مسلمانوں کو نقصان ہوتا ہو۔ مثلاً اسلحہ کی آزادانہ تجارت اور آمدورفت کو نہ صرف دشمن سے جنگ کے دوران بلکہ کسی اندرونی فتنہ اور انتشار کی صورت میں بھی روکا جا سکتا ہے۔

مستامنین یعنی دارالحرب کے ایسے لوگ جو دارالاسلام میں باقاعدہ اجازت لے کر آئے ہوں ہر اعتبار سے وہی حقوق رکھتے ہیں جو خود دارالاسلام کے غیر مسلم شہریوں کو حاصل ہیں اور ان کی اندرون ملک آمدورفت اور اپنے وطن واپس جانے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ لیکن دوران جنگ اگر حکومت وقت محسوس کرے کہ عسکری ضروریات کے پیش نظر ان کی آمدو رفت اور وطن واپسی پر پابندیاں عائد کرنا ناگزیر ہے تو ضروریات کی حد تک ایسا کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب ایسے لوگوں کی اپنے وطن واپسی سے دشمن کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

جنگ کے باب میں اسلام شاید انسانی تاریخ کا پہلا نظام ہے جس نے دشمن کو نقصان پہنچانے کی حدود متعین کیں۔ سرکار دو عالم ﷺ نے جنگ کو تدبیر اور حکمت عملی کی بازیگری (خدعہ) قرار دیا' لیکن خیانت اور دھوکہ دہی کی اجازت نہیں دی۔ دشمن کو شبہ میں ڈالنے کے لیے توریہ پر عمل فرمایا۔ یعنی ایسے ذو معنی فقرے جن سے دشمن کو آپؐ کے اصلی اقدام یا ہدف کا اندازہ نہ ہو سکے اور وہ کسی غلط فہمی میں پڑ کر آپؐ کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ سیرت پاک میں ایسی تدبیروں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن میں آپؐ نے کوئی غلط بیانی' بدعہدی یا بے وفائی کئے بغیر محض حکمت عملی سے دشمن کو شکست دی۔

مباحات جنگ کے سلسلہ میں اسلام نے ایسے عسکری اقدامات کی بھی اجازت دی ہے جن کا مقصد کسی محدود اور فوری کارروائی کے ذریعہ بڑی جنگ کا خطرہ ٹالنا اور زیادہ تباہی کو روکنا ہو۔ چنانچہ سرکار دوعالم ﷺ نے کعب بن اشرف اور ابو رافع جیسے دشمنان اسلام کے خلاف محدود کارروائی کی جس کے نتیجہ میں دونوں دشمنوں سے گلو خلاصی ہو گئی اور ان کی سازشوں سے نجات مل گئی۔ اگر ان دونوں کے خلاف یہ محدود فوجی ایکشن نہ کیا جاتا تو خطرہ تھا کہ وہ کوئی زبردست جنگ مسلمانوں پر مسلط کر دیں اور بڑی تباہی کا سبب بنیں۔

مباحات جنگ کے ساتھ ساتھ اسلام نے منہیات جنگ بھی بیان کر دیے ہیں جن میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ دوران جنگ کون کون سے اقدامات کی ممانعت ہے۔ ایسے اقدامات میں چند اہم اقدامات درج ذیل ہیں۔

غیر مقاتلین کا قتل اسلام نے قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے۔ جو لوگ عملاً جنگ میں حصہ نہ لے رہے ہوں اور نہ جنگ میں فنی طور پر دشمن کو کوئی مدد فراہم کر رہے ہوں اور ان کے خلاف تلوار اٹھانا درست نہیں۔ اسی اصول کے تحت رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور بچوں وغیرہ کے قتل کی ممانعت فرمائی اور بار بار اس کو یاد دلایا۔ اسی اصول کے تحت حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اپنے مشہور ہدایت نامہ بنام کمانڈران عساکر اسلام میں راہبوں' خانہ بدوشوں' پادریوں اور چرواہوں کے قتل کی سختی سے ممانعت فرمائی۔ اس اصول کے تحت فقہائے اسلام نے تاجروں' دکانداروں اور سامان ضروری سپلائی کرنے والوں کو قتل کرنا ناجائز قرار دیا۔

منہیات جنگ میں سب سے اہم چیز دشمن کو دھوکہ دینا اور اس سے بدعہدی کا ارتکاب کرنا ہے۔ قرآن مجید

میں متعدد مقامات پر بدعہدی کرنے والوں کو بدترین مخلوق بلکہ بدترین چوپایہ قرار دیا گیا ہے[۲۲]۔ اسی طرح احادیث نبوی میں بد عہدی اور غدر کو بہت بڑا گناہ بتایا گیا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ مختلف مسلم حکمرانوں نے اپنے معاصر غیر مسلم بادشاہوں اور مملکتوں سے کوئی طرز عمل اختیار کرنا چاہا اور فقہائے اسلام نے اس کو بدعہدی قرار دیتے ہوئے حکمرانوں کو اس سے باز رکھا۔

شریعت نے حالت جنگ اور امن دونوں صورتوں میں فساد فی الارض اور فتنہ پردازی کو ایک نہایت مکروہ اور قبیح چیز قرار دیا ہے جس کے خاتمہ کے لئے بعض حالات میں قوت استعمال کرنے کی بھی اجازت دی گئی ہے[۲۳]۔ قرآن مجید میں حرث و نسل کی تباہی کو دشمنان اسلام کی عادت بتایا گیا ہے اور اسے فساد کی ایک قسم قرار دیا گیا ہے[۲۴]۔ اس اصول کے پیش نظر دوران جنگ کھیتوں اور باغات کی تباہی' جانوروں اور بالخصوص دودھ اور گوشت فراہم کرنے والے جانوروں کی نسل کشی' بستیوں کی ویرانی اور دریاؤں اور نہروں کی بندش کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ تاہم جہاں ناگزیر جنگی ضروریات کی بناء پر ضروری ہو وہاں بقدر ضرورت ایسی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً دشمن نے کسی جنگل یا باغ کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا ہو اور وہاں سے حملے کر رہا ہو' دشمن قلعہ بند ہو گیا ہو اور اس کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کے لئے آب رسانی کے ذرائع روک دینا ناگزیر ہو تو جنگی ضروریات کے لئے ایسا کیا جا سکتا ہے۔

اسی ممانعت کی ایک قسم قتل عام کی ممانعت بھی ہے۔ اسلام سے پہلے اور بعد میں بھی بارہا جنگوں کے دوران میں دنیا نے فاتحین کی طرف سے مفتوحین کے قتل عام کے مناظر دیکھے ہیں۔ خود ہمارے برصغیر میں نادر شاہ ایرانی کے ہاتھوں دہلی کا قتل عام مشہور ہے جس کو روکنے اور اس کے منفی اثرات کو ختم کرنے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے رفقاء کا بڑا کردار تھا۔ ایسے قتل عام کے واقعات میں ہزاروں اور لاکھوں بے گناہ انسان مارے جاتے رہے ہیں۔ وہ بھی جن کی ہمدردیاں فاتح کے ساتھ رہی ہوں اور وہ بھی جن کے جذبات و احساسات مفتوح کے ساتھ ہوں۔ اسلام نے قتل عام کی سختی سے ممانعت کی اور کسی بھی بے گناہ انسان کی جان لینے کو فوجداری جرم قرار دیا۔ اسی اصول کے تحت یرغمالی کو قتل کرنے کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔ اس بارہ میں فقہائے اسلام متفق اللفظ ہیں کہ اگر دشمن مسلمانوں کے یرغمالیوں کو قتل بھی کر دے تو تب بھی مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ دشمن کے یرغمالیوں کی جان و مال کو نقصان پہنچائیں۔

مقاتلین یعنی دشمن کے برسر جنگ سپاہیوں کے حقوق میں دھوکہ اور بد عہدی سے گرفتار کرنے یا قتل کر ڈالنے کی ممانعت سر فہرست ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر کسی مسلمان سپاہی نے قلعہ بند دشمن فوجی سے کہا مترس (ڈرو مت) اور وہ یہ سمجھ کر قلعہ سے اتر آیا کہ مجھے پناہ مل گئی ہے اور پھر اس کو قتل کر دیا گیا تو میں بطور قصاص قتل کرنے والے مسلمان سپاہی کو قتل کروا دوں گا۔

مقاتلین کا دوسرا حق یہ ہے کہ ان کے مقتولین کی لاشوں کا مثلہ نہ کیا جائے' یعنی ان کی شکلوں کو بگاڑا نہ جائے۔ انکی لاشوں کا احترام کیا جائے اور ان کو یا تو دشمن کے حوالے کر دیا جائے یا ان کو مناسب طریقہ سے دفن کر دیا جائے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ایک مشرک مقتول کی نعش کے معاوضہ میں دشمن کی پیش کردہ رقم قبول فرمانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ دشمن کے مقتولین کی لاشیں دشمن کے حوالہ کرنے کا معاوضہ وصول نہ کیا جائے۔

مقاتلین کا تیسرا حق یہ ہے کہ ان کو زندہ نہ جلایا جائے۔ حضور علیہ الصلاۃ و السلام نے واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا کہ جلا کر سزا دینے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے رکھا ہے لہٰذا کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی کو آگ کا عذاب دے۔ اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ پرامن شہریوں پر ناپام بم قسم کی چیزیں گرانا اور ان کو جلا کر بھسم کر ڈالنا شرعاً درست نہیں ہے۔

مقاتلین کا سب سے اہم حق یہ ہے کہ دوران جنگ وہ مسلمان فوج کی جس چیز پر قبضہ کریں اور اس کو اپنے قبضہ میں لے کر میدان جنگ سے اپنے علاقے میں منتقل کر دیں اس پر ان کے جائز حقوق ملکیت تسلیم کر لیے جائیں گے۔ فقہائے احناف اس اصول کو احراز کا نام دیتے ہیں جو مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں پر منطبق ہوتا ہے۔ اس اصول کے مطابق میدان جنگ میں دشمن کا مال اگر قبضہ میں لے کر قبضہ کرنے والا اپنے علاقہ میں منتقل کر دے تو اس کو قابض کی جائز ملکیت مانا جائے گا۔ حنفی فقہاء نے اس پر تفصیلی بحثیں کی ہیں۔

نتائج جنگ میں سب سے اہم مسئلہ مال غنیمت اور جنگی قیدیوں کا ہے۔ ان میں سے مال غنیمت تو اصول احراز کے تحت اسلامی ریاست اور مسلمان فوجیوں کی ملکیت قرار پاتا ہے جنگی قیدیوں کی بابت قرآن پاک نے متعدد ہدایات دی ہیں جن کی روشنی میں جنگی قیدیوں کے مستقبل کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

مال غنیمت کے بارہ میں فیصلہ کرتے وقت امام محمد بن الحسن الشیبانی اور کئی دوسرے فقہاء کے نزدیک دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ دشمن سے چھینے ہوئے سازو سامان بالخصوص اسلحہ وغیرہ کا ایسا بندوبست کیا جائے کہ دشمن اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ دوسرے جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں اور بالخصوص لڑنے والے سپاہیوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اگر مال غنیمت کا کوئی ایسا بندوبست کیا جائے کہ اس سے یہ دونوں ہدف حاصل ہو جائیں تو اس سے بہتر کوئی حل نہیں۔ ورنہ کم از کم پہلے ہدف کو ضرور حاصل کر لیا جائے۔ مثلاً دشمن کا اسلحہ اگر اسلامی ریاست میں منتقل کرنا ممکن نہ ہو تو اس کو وہیں تباہ کر دیا جائے یا اگر تباہ کرنا بھی ممکن نہ ہو اور نہ دارالاسلام لے جانا ممکن ہو تو کسی تیسرے فریق کو جو مسلمانوں کا دشمن نہ ہو فروخت کر دیا جائے۔

جنگی قیدیوں کے معاملہ میں ریاست کو فیصلہ کرنے کے وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ ریاست کا سربراہ (امام)

یہ فیصلہ کرتے وقت دو چیزوں کو پیش نظر رکھے گا' ایک تو یہ کہ دشمن کی عددی اور عسکری قوت کو توڑا جا سکے اور دوسرے یہ کہ جو فیصلہ کیا جائے وہ اسلامی ریاست کے مفاد میں ہو۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کی رو سے جنگی قیدیوں کے بارہ میں درج ذیل پانچ صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔

۱۔ جنگی قیدیوں کو قتل کر دیا جائے' خاص طور پر ان صورتوں میں جب وہ خوفناک جنگی جرائم میں ملوث رہے ہوں یا ان کا وجود اسلامی ریاست کے لئے خطرہ بن گیا ہو۔ عہد جدید میں مختلف ممالک نے اس بارہ میں باہم معاہدات طے کر رکھے ہیں جن کے اندر رہ کر ہی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ جنگی قیدیوں کو ویسے ہی چھوڑ دیا جائے اور گویا دشمن پر ایک ایسا احسان کیا جائے جس کا وہ ممنون و شکر گزار رہے اور مسلمانوں کے خلاف جنگی کارروائیاں اور سازشیں کرنا بند کردے۔

۳۔ جنگی قیدیوں سے فدیہ کی رقم لے کر ان کو رہا کر دیا جائے۔

۴۔ مسلمان قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جائے۔

۵۔ اگر پہلی چار صورتوں پر عمل کرنا ممکن نہ ہو یا کسی وجہ سے مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ہو تو دشمن کے جنگی قیدیوں کو غلام بنا لیا جائے لیکن جن لوگوں سے کسی صلح یا معاہدہ کے نتیجہ میں جنگ بندی ہوئی ہو ان کے جنگی قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ یاد رہے کہ اسلام میں غلامی کی حیثیت ایک ایسی قید بامشقت بلکہ بے مشقت کی سی ہے جس کا کوئی مالی بوجھ سرکاری خزانہ پر نہیں پڑتا اور قیدیوں کی خدمات یا مہارت سے مسلم معاشرہ استفادہ کرتا رہتا ہے اور ان کو بالتدریج مسلم معاشرہ میں برابری کی سطح پر ضم کرتا رہتا ہے۔ جنگی قیدیوں کو مسلمان بنا کر مسلم معاشرہ میں ضم کر لینے کی یہ پالیسی خواتین قیدیوں کے بارہ میں زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء

بین الاقوامی قانون یا مغرب کا انٹرنیشنل لاء آج کل دو بڑے بڑے شعبوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ایک پبلک انٹرنیشنل لاء کہلاتا ہے' اور دوسرے کو پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء کا نام دیا گیا ہے۔ پبلک انٹرنیشنل لاء ریاستوں کے تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ اور پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء افراد کے ذاتی حقوق و فرائض اور ان کے اپنے اپنے ممالک میں رائج قوانین کے تعارض اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے مسائل سے بحث کرتا ہے۔ لیکن فقہاء اسلام نے پہلے ہی دن سے پبلک اور پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء کی کوئی تفریق نہیں رکھی۔ فقہائے اسلام نے سیر کی کتابوں میں جہاں بین الاقوامی قوانین کے دوسرے عام پہلوؤں پر بحث کی وہاں افراد کے حقوق و فرائض بھی بیان کیے۔ چنانچہ اہل ذمہ اور مستامنین کے حقوق و فرائض کا ذکر کیا جا چکا ہے جو دراصل پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء کے موضوعات ہیں۔

اگرچہ فقہائے کرام نے ان دونوں شعبوں میں کوئی تفریق یا تمیز نہیں کی لیکن ان کے بنیادی معاملات و مسائل کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے فقہاء کے ہاں تقسیم ابواب و مضامین اور ترتیب موضوعات رائج الوقت قوانین کی تقسیم موضوعات اور ترتیب مضامین سے بہت مختلف ہے۔ اس لیے یہ مباحث فقہ کی کتابوں میں متفرق ابواب کے تحت بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ تاہم اگر ہم چاہیں تو آسانی سے ان سب احکام کو علیحدہ علیحدہ مرتب اور بیان کر سکتے ہیں۔

پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء کا سب سے اہم مسئلہ اور بنیادی سوال یہ ہے کہ جب دو قوانین میں تعارض ہو یعنی کسی ملک کے ریاستی قانون یا پبلک لاء اور دوسرے ملک کے شخصی قانون یا دونوں ممالک کے شخصی قوانین میں تعارض پیدا ہو تو اس تعارض کو کیسے رفع کیا جائے اور افراد کے حقوق کا تحفظ کیونکر کیا جائے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ایک ملک سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا شخص دوسرے ملک سے تعلق رکھتا ہے اور ان دونوں کے اپنے اپنے ممالک میں لین دین کے قوانین مختلف ہیں۔ پھر یہ دونوں کسی تیسرے ملک میں جا کر لین دین کرتے ہیں جہاں کے قوانین پہلے دونوں ممالک سے مختلف ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں لین دین میں کس ملک کے قوانین کا لحاظ رکھا جائے۔ فرض کیجئے ایک ملک کے قوانین کی رو سے ایک چیز کی ملکیت ناجائز ہے۔ دوسرے ملک میں اسی چیز کی ملکیت کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دوسرے ملک میں اول الذکر ملک کے قوانین کو جائز سمجھا جائے گا یا نہیں۔ اگر جائز سمجھا جائے گا تو اس کے قواعد کیا ہوں گے' اور اگر ناجائز سمجھا جائے گا تو اس کے قواعد کیا ہونگے۔

یہ وہ قوانین و قواعد ہیں جس کو پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء کا سب سے اہم موضوع سمجھا گیا ہے۔ بلکہ بعض مغربی مصنفین نے تو بین الاقوامی قانون کے اس شعبہ کو پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء کہنے کی بجائے Conflict of Laws یا تعارض قوانین ہی کا نام دیا ہے اور اس کو وہ قانون کا ایک الگ شعبہ قرار دیتے ہیں۔ قانون کے ایک مستقل بالذات شعبہ کے طور پر پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء زیادہ پرانی چیز نہیں ہے۔ جیسے جیسے یہ موضوع مرتب ہوتا چلا گیا اس کی تفصیلات میں بھی اضافہ ہوتا گیا' اور یوں چار اہم مسائل اس کے دائرہ کار میں شامل قرار پائے۔ ان چار بنیادی مسائل کی بنا پر اسے ان چار شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا' اور انہیں چار بنیادی معاملات و مسائل کے جوابات کو پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء کے چار بنیادی ابواب سمجھا گیا۔

اس میں سب سے پہلا سوال شہریت اور اس کے متعلقہ مسائل کا ہے۔ ایک شخص کو کس بنیاد پر ایک ملک میں شہریت حاصل ہوتی ہے اور اس شہریت کی وجہ سے اس پر کون کون سے حقوق و فرائض عائد ہوتے ہیں' بیرون ملک اس کی کیا حیثیت ہے۔ بیرون ملک سے آنے والے کو آپ کے ملک میں کس بنیاد پر شہریت حاصل ہو

گی۔ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے جو پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء میں زیر بحث آتا ہے۔ اس سے ملتا جلتا دوسرا مسئلہ پروانہ راہداری یا ویزا کا ہے۔ یہ قریب قریب وہی چیز ہے جس کو اسلامی فقہ میں امان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ امان کے احکام کیا ہونگے اور کسی کو کیونکر اور کیسے امان دی جائے گی؟ اس کے بارے میں فقہائے کرام نے تفصیلی قواعد مرتب کیے ہیں جن کی بنیاد پر آج کے دور میں ہم اسلامی ممالک میں ویزا اور راہداری کے احکام طے کر سکتے ہیں۔ تیسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ کسی شخص کی شخصیت (Status) کا تعین ریاست میں اور ریاست سے باہر کیسے ہو گا' ریاست میں اس کو جو حقوق حاصل ہیں کیا ریاست سے باہر بھی وہی حقوق اس کو حاصل ہونگے؟ اس پر جو ذمہ داریاں ریاست کے اندر عائد ہوتی ہیں کیا ریاست سے باہر بھی اس پر وہی ذمہ داریاں عائد ہونگی؟ اگر ایسا ہو اور اس پر ریاست سے باہر بھی وہی ذمہ داریاں عائد کی جائیں تو اس کے اصول و قواعد کیا ہونگے؟ چوتھا اہم مسئلہ یہ ہے کہ ریاست کا دائرہ کار غیر ملکی افراد پر کس نوعیت کا ہو گا' کب اور کس حوالے سے براہ راست دائرہ کار ہو گا اور کب اور کن شرائط کے ساتھ یہ دائرہ کار بالواسطہ ہو گا یا غیر ملکی افراد پر ریاست کا جورس ڈکشن (Jurisdiction)۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ بین الاقوامی قانون کا اصل موضوع ریاستوں کے باہمی تعلقات ہیں۔ اس کے بنیادی مباحث میں اصل نکتہ یہی ہوتا ہے کہ ریاستوں کے باہمی تعلقات کو کیسے منظم اور منضبط کیا جائے۔ ریاستوں سے آگے بڑھ کر افراد پر قوانین کا انطباق کیسے ہو؟ لیکن جیسا کہ ان موضوعات کے احاطہ سے اندازہ ہوتا ہے یہ دونوں قسم کے موضوعات بہت واضح اور متعین حدود کے ساتھ محدود نہیں ہیں۔ بلکہ ان دونوں موضوعات کی حدود ایک دوسرے میں اس طرح مدغم اور مخلوط ہیں کہ قطعیت اور حتمیت سے یہ طے کرنا دشوار ہے کہ کب کسی مسئلے کی حدود پبلک انٹرنیشنل کا حصہ بن جائیں گی اور کب پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء میں داخل ہوں گی۔ آجکل اس واضح تقسیم کے باوجود کہ انٹرنیشنل لاء کو دو جداگانہ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے کئی مسائل ایسے ہیں جو جزوی طور پر ان دونوں شعبوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ بعض معاملات ایسے ہیں کہ ان کی تکرار دونوں شعبوں میں کرنی پڑتی ہے۔ پبلک انٹرنیشنل لاء میں اگر ایک پہلو سے بحث ہوتی ہے تو پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء میں دوسرا پہلو زیر بحث آتا ہے۔ خاص طور پر جب ہم سیر یعنی مسلمانوں کے انٹرنیشنل لاء پر گفتگو کرتے ہیں تو یہ پہلو اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ فقہاء کرام نے اسلام کے انٹرنیشنل لاء کو اس طرح دو شعبوں میں تقسیم نہیں کیا ہے۔ انہوں نے دونوں قسم کے معاملات کو ایک ہی جامع عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔

تعارض قوانین یا کنفلکٹ آف لاز جس کے لیے فقہاء کی اپنی اصطلاح تحارج زیر استعمال رہی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جب ایک غیر مسلم کسی دوسری مملکت میں جائے یا کوئی حربی یا کوئی اور غیر مسلم چاہے وہ کسی معاہد ملک کا ہو یا متصالح ملک کا ہو جب وہ اسلامی ملک میں آئے تو یہاں کی عدالتیں اس کے ان معاملات پر کیسے بحث

کریں گی جو اس نے دارالحرب، دارالعہد یا دارالصلح وغیرہ میں کیے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ سودی رقم لے کر اسلامی مملکت میں آیا جہاں ظاہر ہے کہ سودی رقم کا لین دین حرام اور سودی رقم کی ملکیت قانون کی نظر میں باطل ہے۔ اس کی بنیاد پر دارالاسلام میں اس سودی رقم کے سلسلے میں اس کے کوئی حقوق تسلیم نہیں کیے جاتے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس نووارد پر اس ملک کے قوانین کا انطباق ہو گا جہاں سے وہ آیا ہے اور بناء بریں اس کو اس سودی رقم کا جائز مالک تسلیم کر لیا جائے گا۔ یا اس پر اسلامی مملکت کے قوانین کا انطباق ہو گا۔ اور وہ رقم اس کی جائز ملک نہیں مانی جائے گی۔ یہ تعارض کی وہ کیفیت ہے جو پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء میں بھی اسلامی نقطہ نظر سے زیر بحث آتی ہے۔ اسی سے ملتا جلتا ایک اور سوال ہے جو صدر اسلام میں تو پیدا نہیں ہوا بلکہ خاصا بعد میں پیدا ہوا ہے اور فقہاء کرام نے اس سے بحث بھی کی ہے۔

فقہائے کرام کی یہ بحث اس زمانے کی تقسیم مضامین کے لحاظ سے سیر کا موضوع نہ تھی بلکہ بڑی حد تک علم اصول فقہ یا اسلام کے دستوری قانون (الاحکام السلطانیہ) کا موضوع قرار دی جاتی تھی اور اس لیے علم اصول فقہ ہی کی کتابوں میں اس سے بحث بھی کی گئی۔ یعنی اگر ایک مسلم ریاست کا شہری جہاں اس پر مثلاً فقہ شافعی نافذ ہے کسی ایسی اسلامی ریاست میں چلا جائے جہاں فقہ حنفی نافذ ہو تو دونوں فقہوں کے تعارض کو کیسے رفع کیا جائے گا، اور اس رفع تعارض کے قوانین کیا ہوں گے۔ فقہائے اسلام نے اس بحث کو عموماً اصول فقہ کے دائرہ کار میں رکھا ہے یا کہیں کہیں اسلام کے دستوری اور انتظامی قانون میں۔ انھوں نے اس کو علم سیر کا موضوع قرار نہیں دیا۔ لیکن اگر آج اسلام کا پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء دور جدید کی مروجہ ترتیب اور تقسیم مضامین کی روشنی میں مرتب کیا جائے تو اس موضوع کو اسلام کے پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء کا موضوع قرار دیا جا سکتا ہے۔

پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء کا سب سے بڑا مسئلہ شہریت کا مسئلہ ہے۔ دارالاسلام میں کس کو کب اور کس بنا پر شہریت حاصل ہوتی ہے؟ شہریت کے قواعد کیا ہوتے ہیں؟ اور وہ کون سے اصول ہیں جن کی بنا پر کوئی شخص کسی ریاست میں شہریت کا مطالبہ کر سکتا ہے؟ اور وہ کون سے حالات ہیں جن میں کسی شخص کو شہریت دینے سے انکار کیا جا سکتا ہے؟ یہ اور ان جیسے متعدد اہم مسائل ہیں جو شہریت یا سٹیزن شپ کے مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج کے دور میں شہریت کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اس لیے کہ آج کل وطنی قومیت کا دور دورہ ہے۔ جدید دنیا کے ایک بڑے حصہ نے یورپ کے علاقائی اور وطنی نیشنلزم کو ایک طے شدہ اصول کے طور پر کم از کم عملاً تسلیم کر لیا ہے اور اسی اصول کو آج بدقسمتی سے شہریت کے تمام احکام اور قواعد کی بنیاد کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ مسلم ممالک نے بھی اسی علاقائی وطنیت (Territorial Nationalism) کو اپنا لیا ہے جس کی وجہ سے دنیائے اسلام میں بہت سے ایسے مسائل پیدا ہو رہے ہیں جو ایک مسلم ماحول میں پیدا نہیں ہونے چاہئیں اور

جو ماضی میں کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ علاقائی نیشنلزم کی بنیاد جن چیزوں پر ہے وہ سب اسلام میں ناقابل قبول ہیں۔ رنگ، نسل، زبان اور علاقہ کی وحدت اور تعصبات ان میں سے کوئی بنیاد بھی اسلام میں اجتماعیت کی اساس کے طور پر قابل قبول نہیں ہے۔ فقہائے اسلام نے ان کو اس لائق بھی نہ جانا کہ ان پر بحث بھی کی جائے۔ انہوں نے دارالاسلام کو ہمیشہ ایک سیاسی وحدت تسلیم کیا اور اسی بنیاد پر فقہ سیر کے جملہ احکام کو مرتب کیا گیا۔ مختلف حکومتوں اور ریاستوں کے وجود کے باوصف کہ جنہیں بیک وقت دارالاسلام کہا جاتا تھا دنیائے اسلام میں مشترک شہریت کا اصول رائج تھا۔ جو شخص ایک مسلم ریاست کا شہری تھا اس کو دوسرے مسلم ملک کی شہریت خود بخود حاصل ہوتی تھی۔ جوں ہی وہ کسی دوسری مسلم ریاست میں قدم رکھتا تھا وہ آپ سے آپ اس کا شہری شمار ہوتا تھا۔ ماضی قریب میں حتیٰ کہ پچھلی صدی ہجری کے اوائل بلکہ وسط تک جب تک کہ مختلف مسلمان ملکوں نے یورپ کی علاقائی وطنیت سے متاثر ہو کر دوسرے ملکوں سے آنے والے مسلمانوں پر ناروا پابندیاں عائد کرنا شروع نہیں کی تھیں اس وقت تک دنیائے اسلام میں کوئی وطنی قومیت یا علاقائی نیشنلزم موجود نہ تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آج جب کہ یہ بنیاد پیدا کر دی گئی ہے اس کی موجودگی میں شہریت کے مسائل کو کیسے حل کیا جائے؟ آج ان سوالات کا جواب کیا دیا جائے جو دور جدید کے اس سب سے بڑے بت نے پیدا کر دیئے ہیں۔

اسلام میں غیر جانبداری کا تصور

جب ہم اسلام کے تصور غیر جانبداری کی بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اس غلط فہمی کا ازالہ کر دینا چاہیے جو بہت سے مغربی مصنفین نے جان بوجھ کر پیدا کی ہے اور آج بھی پیدا کی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں کثیر العناصر معاشرے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ یعنی اسلام کسی Pluralistic Society کا تصور اپنے اندر نہیں رکھتا بلکہ ان حضرات کے خیال میں Monolithic Society رکھتا ہے جس میں صرف ایک قوم اور ایک امت پائی جاتی ہے، اور دوسرے تمام لوگ اس کے ماتحت ہوتے ہیں جنہیں کوئی آزاد اور خودمختار حیثیت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ لیکن اسلام کے بارہ میں یہ تاثر خاصا منفی اور بہت حد تک غلط فہمی (دانستہ یا نادانستہ) پر مبنی ہے۔ اس سوال کا کہ کیا اسلام کے نظام میں کسی کثیر العناصر معاشرے کی گنجائش ہے، دو پہلوؤں سے جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے اندر اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب و نظریات کے ماننے والوں کو کس حد تک حقوق و مراعات حاصل ہیں۔ اس کے بارے میں گفتگو کی جا چکی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اسلام نے اہل ذمہ اور دوسرے غیر مسلم افراد کو اپنے معاشرے میں کیا کیا مراعات دی ہیں۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے ساتھ جو معاہدے کیے ان میں غیر مسلموں کو کیا کیا حقوق دیے گئے اور کیا کیا مراعات دی گئیں۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان حقوق و مراعات کا کیسے تحفظ فرمایا اور ان کو ان حقوق کے تحفظ کے لیے کیا کیا

ضمانتیں دیں۔ پھر فقہائے اسلام نے کس طرح ان کے مذہبی اور دیگر حقوق کی تفصیلات مدون کیں اور ائمہ اسلام نے کس طرح حکمرانوں کے خلاف کھڑے ہو کر ان حقوق کو منوایا۔

۲۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی حدود سے باہر بین الاقوامی سطح پر اسلامی ریاست دوسری ایسی ریاستوں کا وجود کھلے دل سے تسلیم کرتی ہے جو اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب کی پیروکار ہوں جن کا نظام قانون اور دستور اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب یا تصور پر مبنی ہو اور ان کے ساتھ اسلامی ریاست کا تعلق ایک پرامن اور مسلسل بقائے باہمی کا ہو۔

اس سوال پر جب ہم قرآن پاک کی روشنی میں غور کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ قرآن پاک نے ایک عمومی اور اصولی ہدایت مسلمانوں کو دی ہے' اور وہ ہدایت یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر جن قوموں سے تعلقات قائم کیے جائیں ہ شہری ریاستیں ہوں' قبائل ہوں' یا آج کل کے دور کی بڑی بڑی ریاستیں ہوں یا آئندہ آنے والی اس سے مختلف انداز کی ریاستیں ہوں' ان سب کے درمیان تعلقات کو اس اصول کی بنا پر قائم کیا جائے گا جو سورہ ممتحنہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ دوستانہ بین الاقوامی اور بین الملکی تعلقات کے نقطہ نظر سے غیر مسلموں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مخالفین اور غیر مخالفین۔ یہاں مخالفین سے مراد وہ غیر مسلم ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو اللہ کے راستے پر چلنے سے روکا ہو' انہوں نے مسلمانوں کو ان کے گھر بار سے نکالا ہو' مسلمانوں پر جنگیں مسلط کی ہوں' ان کے جان و مال کو تباہ و برباد کیا ہو ان کی عزتیں لوٹی ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے کھلے دشمنان انسانیت سے دوستی اور پر امن بقائے باہمی کی بات کرنا منافقت اور بے غیرتی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ آج کے سیاق و سباق میں بوسنیا کے سربوں اور برما کے بدھوں کی مثال اس ضمن میں دی جا سکتی ہے۔ ایک گروہ تو یہ ہے۔

دوسرا گروہ غیر مخالفین کا ہے۔ غیر مخالفین سے مراد غیر مسلموں کا وہ گروہ ہے جنہوں نے مسلمانوں کو گھروں سے نہیں نکالا۔ نہ مسلمانوں کو پریشان کیا نہ ان کے دین کے سلسلے میں رخنہ ڈالا اور نہ مسلمانوں سے اس انداز کی دشمنیاں کیں جیسی آج سرب فوجی اور عوام کر رہے ہیں' یہ دوسرا گروہ ہے جس کے بارے میں قرآن پاک کی واضح ہدایات یہ ہیں: لاینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین ولم یخرجو کم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم۔ جن لوگوں نے دین کے معاملے میں تمہیں پریشان نہیں کیا اور تم سے مقاتلہ و مقابلہ نہیں کیا' تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا اللہ تعالیٰ تم کو اس سے نہیں روکتا کہ تم ان سے بر کا معاملہ رکھو' یعنی نیکی کرو اور ان کے ساتھ عدل و انصاف کے ساتھ معاملہ کرو۔ ان کے ساتھ جو بہتر سے بہتر معاملہ کرنا چاہو وہ کرو۔

بر قرآن پاک کی ایک جامع اور معروف اصطلاح ہے جس میں معاشرتی بھلائیوں کا ایک ایسا جامع نقشہ دیا

گیا ہے جس میں رفاہی معاشرہ کے سارے پہلو شامل ہیں۔ سورہ بقرہ میں ایک جگہ اس بر کے بہت سے پہلو ذکر کیے گئے ہیں: لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من آمن باللہ والیوم آخر والملئکۃ والکتٰب والنبیین و آتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتمی والمسکین و ابن السبیل والسائلین و فی الرقاب و اقام الصلاۃ و آتی الزکوۃ والموفون بعھدھم اذا عھدوا والصابرین فی الباساء والضراء و حین الباس۔ اس آیت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ معاشرتی سطح پر انسانوں کی فلاح و بہبود کے تمام اقدامات بر میں شامل ہیں۔ انسانوں کی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے سارے اعمال اور انسانوں کی عمومی خدمت انجام دینا یہ سب باتیں سورہ بقرہ کی اس آیت کی روشنی بر کی مختلف صورتیں ہیں۔

ایک بنیادی اصول تو قرآن پاک نے یہ بیان کیا لیکن اس کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے کہ اس اصول کی عملی تفسیر مشکل اور تطبیق ناقابل عمل ہے۔ اس لیے کہ مذکورہ بالا شرائط پر پوری اترنے والی غیر مسلم ریاستیں کم ہوں گی۔ لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ صدر اسلام میں مسلمانوں کے جن لوگوں سے تعلقات رہے اور جن اقوام سے لین دین ہوا ان میں سے متعدد اقوام اور ممالک ایسے تھے جن سے اس نوعیت کے تعلقات قائم ہوئے۔ تاہم اگر بالفرض کوئی ایسی قوم نہ بھی ہو اور مسلمانوں کے تعلقات اس ضمن میں دیگر اقوام سے محاربہ ہی کے رہے ہوں تو وہاں بھی یہ اصول صاف طور پر کارفرما دیکھا جا سکتا ہے' جیسا کہ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ' مکہ کے قریشیوں کے ساتھ اور آذری ایرانیوں اور مصر کے قبطیوں کے ساتھ ہوتا رہا۔ علی ہذا القیاس دوسری بہت سے اقوام سے آغاز میں یہی کوشش کی گئی کہ تعلقات کی نوعیت عدم محاربہ اور عدم مداخلت پر مبنی ہو' اسلامی دعوت کی نشرواشاعت میں رکاوٹ نہ ہو اور وہ کسی جنگی معاملہ میں مسلمانوں کے کھلے دشمن کا ساتھ نہ دیں۔ قرب و جوار کے درجنوں قبائل سے (جو اس زمانہ کے لحاظ سے شہری ریاستوں کے حیثیت کے حامل تھے) انہیں خطوط پر معاہدے کیے گئے۔

اس معاملے میں جن قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات محاربے کے رہے ان سے بھی ایک مرحلہ ایسا پیش آ سکتا ہے کہ محاربہ کرنے والے محاربے سے الگ ہو جائیں اور واقعی ایک ایسا تعلق قائم ہو جائے جس کو پرامن تعلقات کے دور کی ابتدا کہا جا سکے۔ اس صورت میں معاہدوں کے ذریعہ غیرجانبداری کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس امکان کی طرف قرآن پاک کی سورہ نساء کی آیات میں اشارہ ملتا ہے۔ اس ضمن میں قرآن پاک نے اس کے لیے اعتزال کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی الگ ہو جانے کے ہیں' ہوتا ہے: فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوالیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا۔ یعنی اگر لڑنے والے الگ ہو جائیں (اعتزال کے معنی ہیں دو متحارب فریقوں کے بارہ میں کسی تیسرے فریق کا الگ رہنا۔) اگر وہ تمہاری اور تمہارے دشمنوں کے درمیان ہونے والی کشمکش سے الگ ہو جائیں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تمہارے ساتھ مسالمہ (باہمی امن و

سلامتی) کے تعلقات رکھیں تو پھر اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان کے خلاف جنگ کرنے کا اختیار نہیں دیا۔ اس سلسلے کی دوسری آیت سورہ نساء ہی کے اس سلسلہ بیان میں یہ ہے کہ اگر وہ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے باہمی محاربہ سے الگ نہ ہوں اور تمہارے ساتھ سلامتی کے تعلقات قائم کرنے کی پیشکش نہ کریں اور لڑائی سے ہاتھ نہ کھینچیں تو پھر ان سے جنگ کرو اور جیسے اور جہاں موقعہ ملے ان کو کیفرکردار تک پہنچاؤ۔ ان لوگوں کے خلاف لڑنے کے لیے تمہیں کھلی اجازت (سلطانا مبینا) حاصل ہے۔ سلطان مبین کے معنی مترجمین قرآن نے کھلی سند، صریح اجازت، صاف گرفت، صاف حجت وغیرہ کے کیے ہیں جس سے یہی پتا چلتا ہے کہ اس صورت میں ایسے لوگوں سے جنگ کرنے کی کھلی اور مکمل اجازت ہے۔

اس پورے سلسلہ بیان میں اعتزال کا لفظ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے اور دونوں جگہ دو متحارب فریقین کے درمیان غیرجانبداری کے مفہوم میں آیا ہے۔ اس کی بنیاد پر یہ اصول بن گیا کہ اگر کوئی ریاست مسلمانوں کے بارے میں غیرجانبدار رہنا چاہتی ہو، یعنی مسلمانوں کے اور غیرمسلموں کے محاربے میں الگ رہنا چاہتی ہو تو وہ ان تین شرائط کے ساتھ رہ سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں سے جنگ نہ کرے، مسلمانوں کے دشمنوں سے الگ رہے اور مسلمانوں کے ساتھ پرامن تعلقات رکھے۔ ایک چوتھی شرط جو خود بخود مقدر (Understood) ہے جس کے بارے میں دوسری نصوص میں واضح ہدایت ہیں وہ یہ کہ اس انتظام سے اسلام اور کلمۃ اللہ کی سربلندی پر زد نہ پڑے اور اسلام اور مسلمانوں کے وقار پر حرف نہ آئے۔ اگر یہ شرائط پوری ہوں تو پھر ان چیزوں کی پابندی ملحوظ رہے گی۔

یہ وہ دو بنیادی آیات ہیں جن سے فقہائے کرام نے غیرجانبداری کے اصول کی بابت استدلال کیا ہے۔ ان آیات کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے متعدد واقعات اور آپ کے کیے ہوئے کئی معاہدے ایسے ہیں جن سے بین الاقوامی تعلقات میں غیرجانبداری کی مزید تفصیلات ملتی ہیں اور جن کو انہی احکام و نظائر کی بنیاد قرار دیتے ہوئے فقہائے کرام نے بین الاقوامی قوانین اور تعلقات کے باب میں غیرجانبداری کے دیگر احکام مرتب کیے ہیں۔ قدیم فقہاء اسلام میں سے جن حضرات نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے انہوں نے جو اصول وضع کیے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اسلامی ریاست غیرجانبداری کے باب میں کن کن اعتبارات (Considerations) کو پیش نظر رکھے گی اور کن کن اصولوں پر کاربند ہو گی۔ اس سلسلے میں جب اعتزال کا لفظ احادیث میں تلاش کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ احادیث میں بھی یہ لفظ انہی اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی دو متحارب فریقوں کے مابین کسی تیسرے فریق کی پوزیشن اور اس کے تعلقات کی نوعیت ایسی ہونا کہ اس کو متحاربین کے آپس کے جھگڑے سے کوئی سروکار نہ ہو۔ سنن ابوداؤد میں ابواب الفتن والملاحم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں اس مضمون کی بہت سی احادیث ہیں کہ مسلمانوں میں فتنے اور اختلافات ہونگے اور امت کو بے شمار

فتنوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ فتنوں کے اس دور میں آپ نے ان لوگوں کے طرز عمل کو پسندیدگی کی سند عطا فرمائی جو مسلمانوں کے آپس کے ان محاربوں سے الگ رہیں گے اور دونوں میں سے کسی ایک فریق کا ساتھ نہ دیں گے۔ یہ بھی اسی غیرجانبداری کی ایک قسم ہے جس کے لیے قرآن مجید میں اعتزال کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ یہاں مذہبی اور سیاسی نوعیت کے جو اندرونی اختلافات ہوں انہیں بھی اعتزال یعنی غیرجانبداری قرار دیا گیا اور اس کو ایک مثبت اور قابل قبول رویہ کے طور پر ذکر کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد کبار صحابہ مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس طرح کے اختلافات اور فتنوں کے دور میں غیرجانبداری کا رویہ اختیار کیا۔

تاہم اس سے پہلے ایک اور مثال غیرجانبداری کی ملتی ہے جو ہماری اس گفتگو کے سیاق و سباق میں ان سے مثالوں سے زیادہ اہم معلوم ہوتی ہے۔ یہ گویا ایک مسلم ایڈمنسٹریشن کی غیرجانبداری کی مثال ہے۔ صلح حدیبیہ کا واقعہ ہمارے سامنے ہے کہ جب وہاں طویل گفت و شنید کے بعد معاہدہ لکھا جا چکا تو اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ کوئی مسلمان جو مکہ سے مدینے چلا جائے گا' اس کو مدینے سے واپس کر دیا جائے گا اور اگر کوئی شخص مدینے سے مکہ واپس آیا تو اسے قریش واپس نہ کریں گے۔ چنانچہ اس شرط کے بموجب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ جانے کے خواہشمند دو نوجوان صحابیوں ابو جندل اور ابو بصیر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ لے جانے سے معذرت کر دی اور مکہ واپس کر دیا۔ اور اس معاہدے کی رو سے انہیں حکم دیا کہ مکہ واپس چلا جائیں۔ اگرچہ بعض صحابہ کرام کو ان حضرات کا یوں بے سہارا چھوڑا جانا خاصا گراں محسوس ہوا تھا۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدے کے بعد واپس مدینہ تشریف لے گئے تو ابو بصیر بھی کفار مکہ سے بھاگ کر مدینہ آ گئے۔ پیچھے کچھ لوگ مکہ سے ان کو لینے آ گئے۔ حضور علیہ السلام نے حسب معاہدہ یہاں سے بھی انہیں واپس کر دیا۔ لیکن ابو بصیر نے مکہ واپسی کے دوران ان دونوں میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرا فرار ہو گیا۔ اب ابو بصیر نے مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ سے جو شخص بھی مسلمان ہو کر فرار ہوتا وہ ابو بصیر کے ہاں آ جاتا۔ اس طرح کافی افراد اکٹھے ہو گئے' اب انہوں نے قریش مکہ کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ ان کارروائیوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوتا رہا لیکن آپ نے ان میں کوئی مداخلت نہ فرمائی۔ یہ تو کہنا مشکل ہے کہ ابوبصیر کا یہ گروہ اور ان کا یہ علاقہ کوئی چھوٹی سے ریاست تھی' ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ کوئی خودمختار علاقہ تھا لیکن ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ آزاد اور خودمختار گروہ تھا جو بہرحال مدینہ کی ریاست کا شہری نہیں تھا۔ مکہ کی شہریت کو یہ لوگ ترک (Repudiate) کر چکے تھے۔ فقہاء کی اصطلاح میں ان کو منعہ یعنی ایک قابل ذکر سیاسی تائید اور عسکری قوت حاصل تھی جو ان کی اپنی قوت تھی اور وہ اس قوت کی بنا پر اپنا دفاع خود کر

سکتے تھے۔ انہوں نے کفار مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی۔ لیکن مدینہ منورہ سے مسلمانوں نے انہیں کوئی مدد نہیں دی۔ اس طرح دونوں کے محاربہ میں مدینہ کی اسلامی اسٹیٹ غیر جانبدار رہی۔

ان تمام مثالوں اور نصوص سے یہ بات پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ غیر جانبداری کا ایک تصور اسلام میں موجود ہے جس کو بنیاد بنا کر دور جدید کے نئے مسائل و معاملات کے لیے تفصیلی احکام مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر مسلم اقلیتوں اور گروہوں کے معاملہ میں ان مثالوں اور بالخصوص ابوبصیر کی مثال سے بڑی رہنمائی ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرز عمل قرآن پاک کے اس اصول کے عین مطابق تھا: الا علی قوم بینکم و بینھم میثاق (یعنی تم ایسی کسی قوم کے خلاف مسلم اقلیت کی مدد نہیں کر سکتے۔ جس سے تمہارا معاہدہ موجود ہو)۔ اس واقعے سے یہ بھی پتہ چلا کہ اگر کسی معاہد غیر مسلم ملک میں کوئی مسلم تنظیم اپنی آزادی کی مسلح جدوجہد کرے تو پڑوس کی اسلامی اسٹیٹ غیر جانبدار رہے گی۔

مزید مطالعہ کے لئے

۱۔ ابوالاعلی مودودی: الجہاد فی الاسلام، طبع لاہور

۲۔ محمد حمید اللہ: مسلم کنڈکٹ آف اسٹیٹ، طبع لاہور

۳۔ مجید خدوری: اسلام کا قانون جنگ و صلح (ترجمہ غلام رسول مہر) کراچی (ایک مسیحی مولف کا نقطہ نظر)۔

۴۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی: خطبات بہاولپور۔ ۲، اسلام کا قانون بین الممالک، طبع بہاولپور۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ امام سرخی: کتاب المبسوط، جلد دہم، صفحہ ۲

۲۔ سورۃ بقرہ: ۱۹۴

۳۔ سورۃ شوریٰ: ۴۰

۴۔ ڈاکٹر حمید اللہ: مسلم کنڈکٹ آف اسٹیٹ، ص ۱۳۵ (بحوالہ امام سرخسی)

۵۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں آیات ۱۷۸، ۱۸۰، ۲۲۸، ۲۳۲، سورہ نساء: ۶، ۱۹ اور ۲۵ وغیرہ

۶۔ سورۃ اعراف: ۱۹۹

۷۔ ان قواعد و ضوابط کی وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو عرف و عادت اسلامی قانون میں، از ساجد الرحمٰن صدیقی

۸۔ بقرہ: ۱۲۷۔۱۲۹

۹۔ مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے معاصر عرب فقیہ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کی نہایت فاضلانہ کتاب احکام الذمیین والمستامنین فی دارالاسلام، طبع بغداد، ۱۹۶۳ء

۱۰۔ تاریخ طبری، جلد پنجم، صفحہ: ۲۵۴

۱۱۔ حوالہ بالا، صفحہ ۴۵۰

۱۲۔ سورۃ توبہ: ۶

۱۳۔ استاذ عبدالکریم زیدان: حوالہ بالا

۱۴۔ شاہ ولی اللہ: حجتہ اللہ البالغہ، جلد دوم

۱۵۔ علامہ محمد خطیب الشربینی، مغنی المحتاج، جلد چہارم، ص ۲۱۰

۱۶۔ راغب اصفہانی: المفردات فی غریب القرآن، زیر مادہ جھد

۱۷۔ سورۃ فرقان: ۵۲

۱۸۔ سورۃ حج: ۳۹۔۴۰

۱۹۔ سورۃ بقرہ: ۱۹۳

۲۰۔ سورۃ توبہ: ۱۳۔۱۵

۲۱۔ سورۃ انفال: ۷۲

۲۲۔ مثلاً سورۃ انفال: ۵۵۔۵۶

۲۳۔ سورۃ بقرہ: ۱۹۱۔۲۱۷

۲۴۔ سورۃ بقرہ: ۲۰۴۔۲۰۵

''مطالعہ اسلامی قانون'' کے مطبوعہ مضامین

۱۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ اول-قرآن

۲۔ اسلامی قانون کے مأخذ' ماخذ دوم سنت

۳۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ سوم اجماع

۴۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ چہارم قیاس

۵۔ اجتہاد ایک تعارف

۶۔ اسلام میں قانون سازی کا تصور اور طریق کار

۷۔ دینی مسائل میں اختلاف، اسباب اور ان کا حل

۸۔ اسلام کا قانون نکاح وطلاق

۹۔ اسلام کا قانون وراثت ووصیت

۱۰۔ اسلام میں عورت کی استثنائی حیثیت اور اس کی وجوہ

۱۱۔ اسلام کا تصور ملکیت ومال

۱۲۔ اسلام کا تصور معاہدہ

۱۳۔ اسلام میں شراکتی کاروبار کا تصور

۱۴۔ مزارعت اور مساقات

۱۵۔ اسلام کا نظام محاصل

۱۶۔ اسلام کا نظام مصارف

۱۷۔ اسلام میں عدل وقضاء کا تصور

۱۸۔ اسلام کا نظام احتساب

۱۹۔ اسلامی نظام عدل وقضاء میں شہادت کا تصور

۲۰۔ اسلام کا تصور جرم وسزا

۲۱۔ اسلام کا فوجداری قانون

۲۲۔ اسلام کا دستوری قانون

۲۳۔ اسلام کا قانون بین الممالک

۲۴۔ اسلام میں ربا کی حرمت اور بلاسود سرمایہ کاری